فہرست

لمعات

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا	مرتبہ: محمد سلیم اختر (لاہور)	3
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	6
حضرت انسان قرآن کے آئینے میں	آصف جلیل، کراچی	25
قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی، کراچی	30
اللہ ورسول ﷺ کی اصطلاح	غلام باری، مانچسٹر	52
تفرقہ عذاب ہے یا جزاء الخیر	ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی	55
کھاتہ داران/خریدار حضرات خصوصی توجہ فرمائیں	ادارہ	62

ENGLISH SECTION

DON'T BLAME GOD FOR OUR FAILURES
By Ubedur Rahman Arain 1

احادیث نبوی ﷺ

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا آپ ﷺ نے فرمایا۔ جس کے پاس سواری ضرورت سے زیادہ ہو۔ وہ اسے دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو۔ جس کے پاس زادِراہ ضرورت سے زیادہ ہو وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِراہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو ضرورت سے زیادہ کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔ (مسلم بحوالہ ریاض الصالحین امام نوویؒ)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم پر کوئی ایسا حبشی غلام بھی جس کا سر کشمش کی طرح چھوٹا ہو امیر بنا دیا جائے تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق حکومت کرے اس کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (بخاری)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرتبہ: محمد سلیم اختر

لمحات

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

دنیا میں سب سے بڑا عذاب، کسی قوم کا تذبذب یا تعلق (Suspense) کی حالت میں رہنا ہے۔ کسی خطرہ کا سامنے آ کر کھڑے ہو جانا اتنا وجہ اضطراب نہیں ہوتا جتنا اس کے متعلق عدمِ یقین کا یہ عالم کہ۔۔۔ اب چھری صیاد نے لی، اب قفس کا در کھلا۔۔۔ جہنم کا یہی وہ شدید ترین عذاب ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ: يَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (14/17)- وہاں موت ہر طرف سے آتی دکھائی دے گی لیکن موت آئے گی نہیں۔ بیم و رجا اور عدمِ تیقن کا یہی وہ جہنمی عذاب ہے جس میں یہ سوختہ بخت قوم گرفتار چلی آ رہی ہے اور یہ سال تو ایسے کرب والم میں گزر رہا ہے جیسے کسی پھانسی پانے والے کی اپیل زیرِ غور ہو۔ غالب نے کبھی کہا تھا کہ ؎

ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

اس میں شبہ نہیں کہ یہ بدنصیب خطۂ زمین، جس اضطراب وخلفشار سے اب گزر رہا ہے، یاس و ناامیدی کی جو مرگ آفریں تاریکی اس کی فضا کو اس وقت محیط ہے۔ عدم سکون وفقدان اطمینان کا جو کرب انگیز عالم اس وقت ہے، قانون شکنی ورجرائم کیشی جس حد تک اب عام ہو رہی ہے، حال جس قدر تاریک اور مستقبل جس قدر تاریک تر نظر آ رہا ہے، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود ہمیں افسردہ خاطر اور ناامید نہیں ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم روزِ اول سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے ساتھ، فطرت کا کوئی خاص پروگرام وابستہ نظر آتا ہے۔ یہ جس طرح ہمیں حاصل ہوا، اس میں بھی فطرت ہی کا ہاتھ کام کر رہا تھا اور اس کے بعد جس طرح یہ ان متعدد زلزلہ انگیز دھچکوں سے محفوظ رہا جن میں سے ہر دھچکا، بڑی سے بڑی مستحکم مملکت کی بنیادوں تک کو ہلا دینے کے لئے کافی تھا اس میں بھی کچھ ادھر ہی کا اشارہ کارفرما رہا ہے۔ ان مہیب زلزلوں میں سب سے زیادہ پرخطر اور تباہ کن وہ تھا جو مشرقی پاکستان میں رونما ہوا لیکن دستِ قدرت نے جس سے ہمیں بال بال بچا لیا۔

سوچئے کہ ہم کس طرح مجیبؔ کی منتیں کرتے اور اس کے پاؤں پڑتے تھے کہ وہ اپنی حکومت قائم کرے! کیا ہماری یہ کوششیں،

اس مملکت کو خود اپنے ہاتھوں، ہندو کے حوالے کر دینے کے لئے نہیں تھیں اور کیا اس خطرہ سے ہمیں فطرت کے دستِ تصرف کے سوا کوئی اور بھی محفوظ رکھ سکتا تھا۔ کیا دنیا کا زیرک سے زیرک ماہر سیاست دان یہ بتا سکتا ہے کہ مجیبؔ کی سمجھ میں ایسی کھلی ہوئی بات کیوں نہ آ سکی اور اس کی عقل و ہوش پر اس قدر دبیز پردے کیوں پڑ گئے! انسانی منطق اس کا جواب نہیں دے سکتی۔ اس کا جواب خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہی دے سکتا ہے جو کہتا ہے کہ: وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّءُ إِلَّا بِأَهْلِهِ (35/43)- تخریبی چالیں چلنے والا، آخر الامر، اپنے جال میں خود آپ پھنس جاتا ہے اور جب اس کا وقت آ جاتا ہے تو وہ کتنا ہی ہوشیار اور چالاک کیوں نہ ہو فَمَا أَغْنَى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم (46/26)- اس کی عقل و خرد اور ہوش و حواس کچھ کام نہیں دیتے۔ ان پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ مجیبؔ کی عقل و ہوش کو تعزیرِ فطرت نے مصلوب کر دیا اور پاکستان اس کی نہایت خطرناک سازش سے بچ گیا۔

یہ ہیں وہ محیر العقول واقعات جن کی بنا پر، ہم کہتے ہیں کہ فطرت کا کوئی پروگرام اس خطۂ زمین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی لئے ہماری مجرمانہ تغافل شعاریوں اور تخریبی کوششوں کے علی الرغم، یہ بار بار محفوظ رہ رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فطرت کا یہ فیصلہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب کوئی قوم، ان (Chances) سے فائدہ نہ اٹھائے اور اپنی روش میں تبدیلی پیدا نہ کرے، تو يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (47/38)- وہ اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے آیا کرتی ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی۔ یہی وہ اصولِ خداوندی ہے جس سے ہمیں ڈر لگتا ہے کہ وہ ہمیں اس قسم کے مہلت کے وقفے بار بار نہیں دے گا۔

نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ جیت جانے سے بھی پاکستان کے تحفظ کا مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ جنگ جیت جانے سے اس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ہو سکتی ہے لیکن اس کی بقا کا راز تو اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت میں ہے لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ یہ قوم ابھی تک ان نظریاتی سرحدوں کا تعین ہی نہیں کر سکی اس لئے ان کے تحفظ کا سوال کہاں سے پیدا ہو گا۔ ان کا تعین کچھ مشکل نہیں لیکن اس سے دانستہ اغماض برتا جا رہا ہے کیونکہ جب یہ حدیں متعین ہو جائیں گی یعنی نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین ہو جائے گا تو قوم کو ان حدود کے اندر رہنا پڑے گا۔ اور یہی چیز قوم کے مفاد پرست گروہوں پر سخت گراں گزرتی ہے۔۔۔ قوم کے اربابِ سیاست پر بھی اور عمایدِ مذہب پر بھی۔ یہ ہے وہ حقیقی سبب جس کی وجہ سے نظریۂ پاکستان کا مفہوم متعین نہیں کیا جاتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

نظریۂ پاکستان، قرآن کے دو لفظوں میں یہ ہے کہ:

فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ (5/48)-

حکومت، خدا کی کتاب (قرآن) کے مطابق قائم کرو۔

بس یہ ہے نظریۂ پاکستان جس کی تشریح قائداعظمؒ نے ان جامع و مانع الفاظ میں فرمائی تھی۔

''اسلامی حکومت قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی کا نام ہے۔''

یہ ہے نظریۂ پاکستان۔۔۔فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ۔جس کے معنی ہیں قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی۔

لیکن یہاں ہر گروہ، ہر پارٹی، ہر فرقہ، ہر حکومت نے اس نظریہ کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی اور اسی سے پاکستان چاروں طرف سے خطرات کے گرداب میں گھر گیا۔اب اس کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس نظریہ کو قوم کا نصب العینِ حیات قرار دیا جائے۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ القلم

(آیات 42 تا اختتام)

عزیزانِ من! آج نومبر 1983ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القلم کی آیت 42 سے ہو رہا ہے: (68:42)۔

سابقہ آیات میں حق و باطل کی کشمکش کا سلسلہ چلا آ رہا تھا اور ایسا نظر آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں مخالفین کے ساتھ حضور ﷺ کی کشمکش اپنی آخری منازل میں ہے' نتائج کھل کر سامنے آ رہے ہیں اور وہ لوگ جو اتنے عرصے تک اپنی سرکشی' تمرد اور استبداد کے عالم میں مخالفت کر رہے تھے' اب انہیں سخت شکست ہوئی ہے۔ یہ ان کے لیے بڑی ناکامیاں ہیں اور جماعتِ مومنین جس نے اتنا عرصہ اس قدر مشقتوں' مصیبتوں اور صعوبتوں میں گزارا ہے' وہ اپنے حسنِ عمل کے خوشگوار نتائج سے مستفید ہو رہی ہے۔ پچھلی آیتوں میں یہ کچھ چلا آ رہا تھا اور جیسا میں نے عرض کیا تھا' یہ جو آخری دو پارے ہیں' ان میں بیشتر اسی کشمکش اور اس کے نتائج کا ذکر زیادہ نمایاں حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ ظہورِ نتائج کا وقت ہے۔ میں پھر دو لفظوں کو دہرا دوں کہ قرآنِ کریم نے یہ سارا ذکر کرنے کے بعد' جسے کہا جاتا ہے' کہ جہنم کا ذکر کیا ہے۔ کہا کہ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ط وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (68:33) یہ عذاب' یہ تباہی' اس دنیا کی ہے۔ آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ بڑا ہوگا۔

اس دنیا کی جہنم کا عذاب

عزیزانِ من! وہ جو میں کہا کرتا ہوں کہ ہر بات کے متعلق یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ قیامت میں ہی جا کے سامنے آئے گی۔ قرآن جو ان کے اوپر مسلط اس قسم کی تباہیوں کا ذکر کر رہا ہے یہ اس دنیا کا عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ وہ آخرت میں جا کے ہوگا۔ یہ عذاب' اسی دنیا میں' قوموں کی شکست کا' تباہی کا' ذلت کا' خواری کا' محتاجی کا' محرومی کا' عذاب ہے۔ یہ اس دنیا میں غلط نظام کے نتیجے میں آتا ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر آ رہا ہے۔

ایک محاورے کی تشریح

عزیزانِ من! اسی تسلسل میں اب اگلی آیت ہے: یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ (68:42) یہاں دو لفظ آئے ہیں: یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (68:42) ''کشف ساق'' کا لفظی ترجمہ یہ ہے: پنڈلی کو ننگا کر دینا' ظاہر کر دینا۔ عربوں کے ہاں یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا تھا جب کہیں مقابلہ بڑی کشمکش کی شکل میں بہت زیادہ شدت اختیار کر جائے تو اس طرح یہ گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں ایک محاورہ بولا جاتا ہے وہ بھی دراصل ایسی سختی کے عالم میں ہی بولا جاتا ہے۔ اصل میں نظر یوں آتا ہے کہ یہ محاورہ ان کے ہاں اس طرح ہوا تھا کہ عربوں کا لباس تو ہمیں پتہ ہے کہ ٹخنوں تک ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ یہ تہمد سے بھی زیادہ اوپر سے نیچے تک ہوتا ہے اور اس قسم کے معرکے میں جب شدت سے مقابلہ ہو اور بھاگنا پڑے تو وہ ظاہر ہے کہ انسان اس کو اٹھا کے ہی بھاگ سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی جو تہمد باندھنے والے لوگ ہوتے ہیں جب ایسے وقت میں انہیں بھی بھاگنا پڑے تو وہ تہمد کو اٹھاتے ہیں حتیٰ کہ شلواروں کو بھی اٹھاتے ہیں۔ ''اوساڈے پنجابی وچ اونوں ٹنگ لینا کیندے سن کہ ذرا ٹنگ لو اونوں۔''[1] اس طرح کرنے سے یہ پنڈلی کا ننگا ہونا ہے۔ اُن کے ہاں کا تو لباس ہی ایسا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ ہی نہیں سکتے تھے جب تک کہ اسے اٹھا نہ لیں۔ اس کے اٹھانے سے بہرحال پنڈلی ننگی ہو جاتی تھی تو اس سے نظر یہ آتا ہے کہ یہ ان کے ہاں ایک محاورہ تھا کہ جب کہیں شدت کی سختی ہو' معرکہ ہو' پریشانی ہو' کشمکش ہو' تو وہ اس میں یہ کہا کرتے تھے کہ ''وہاں تو پنڈلیاں بھی ننگی ہو گئیں۔'' تو قرآن نے اس محاورے کی رو سے بتایا ہے کہ یہ جو معرکہ آرائی کی شدت سی تھی' اس کا نقشہ ان دو لفظوں میں کھینچا ہے لیکن ہمارے ہاں تو آپ ترجمے میں بھی یہ دیکھیں گے اور پھر تفسیروں میں بھی یہ ہوگا کہ جب قیامت ہوگی تو خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا۔

خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا: بخاری کی روایت

یہ لوگ جو یہاں کے متکبر اور سرکش تھے' وہاں قیامت میں بھی اسی طرح سرکش' اسی طرح سر اٹھائے ہوئے' تکبر اور فخر کے ساتھ خدا کے سامنے جائیں گے' کسی طرح سے بھی نہیں جھکیں گے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ یہ روایت موجود ہے کہ پھر خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا اور اس کا اثر یہ ہوگا کہ یہ سب سجدے میں گر جائیں گے۔ اب' عزیزانِ من!

---

[1] ہمارے ہاں پنجابی میں اسے اوپر کر لینا کہتے ہیں کہ ''اسے ذرا اوپر کر لو۔''

اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ خدا اپنی پنڈلی کو ننگا کرے گا۔ دین کی ساری عمارت خدا کے صحیح تصور پر استوار ہوتی ہے' تو اس میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے ہاں خدا کا تصور کس قسم کا ہے' یہی نہیں بلکہ اس سے آگے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہاں کس قسم کا مذہب ہے۔

خدا کے صحیح تصور کی اہمیت

ایک مغربی مفکر ہے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ مجھے صرف یہ بتا دیجیے کہ اس قوم نے اپنی پرستش کے لیے کس قسم کا معبود تجویز کر رکھا تھا تو میں اس قوم کی تہذیب وتمدن وثقافت کے متعلق سب کچھ بتا دونگا۔ گویا خدا کا تصور اتنی اہم چیز ہے۔ ہمیں تو ان چیزوں کا پتہ ہی نہیں ہے۔ ہم نے نہ اِس تصور کے متعلق کبھی تحقیق کی' نہ کبھی یہ معلوم کیا کہ یہ بات کیا ہے۔ ہم تو خدا پر ایمان بھی نہیں لائے ہوئے' مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے' مسلمان چلے جا رہے ہیں' وہی جو مسلمانوں کی چند رسومات ہیں بجالاتے ہوئے آخر تجہیز وتکفین کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ پیدا ہوئے تو کان میں اذان دی' مر گئے تو جنازہ پڑھ لیا۔ عزیزانِ من! خدا کا تصور دین' مذہب' تہذیب' تمدن' ثقافت' اور پھر سیاست کی بنیاد ہے۔ یہ جو خدا کا تصور ہے کہ قیامت میں یہ لوگ کسی اور طریق سے نہیں جھکیں گے تو خدا اپنی پنڈلی ننگی کر دے گا تو اس سے ہمارے ہاں کس قسم کا خدا سامنے آتا ہے: یہی کہ خدا ہے' اس کی پنڈلی ہے اور پھر وہ کپڑا اس سے اٹھا کے ننگی کر دے گا۔

صحیحین کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی دائرۂ اسلام سے خارج کر دے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کو ان احادیث کی رو سے سمجھنا چاہیے تو اس میں یہ لکھا ہے اور صحاح ستہ' چھ صحیح کتابیں ہیں' ان میں سے صحیحین بخاری اور مسلم ہیں' ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اگر آپ اسے نہ مانیں کہ صاحب! خدا اپنی پنڈلی ننگی کر دے گا' تو اس عقیدے کی رو سے آپ مسلمان ہی نہیں رہتے۔ انہی احادیث وروایات پہ آپ کی تفاسیر مبنی ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہیں آپ مستند تفاسیر کہتے ہیں۔ انہیں اٹھا کے دیکھیے اِن میں آپ کو یہی لکھا ملے گا کہ خدا اپنی پنڈلی ننگی کرے گا۔

عزیزانِ من! یہاں کہا یہ ہے کہ اسی زبان کے محاورے کے مطابق اس روز ان کی پریشانی' ان کی مصیبتوں کی حالت شدت اختیار کر جائے گی' انتہا تک پہنچ جائے گی۔ اس وقت مشورہ دینے والے مشورہ دیں گے کہ اب بھی جھک جاؤ لیکن وہ اپنی ضد میں ایسے اڑے ہوئے ہونگے کہ وہاں بھی جھکنا نہیں چاہیں گے۔ یہ عجیب قسم کی قوم تھی۔ ہمیں تو اس تاریخ کا بھی علم

نہیں ہے کہ یہ جو حضورﷺ کو کشمکش تھی‘ جو تصادمات تھے‘ جو مزاحمت ہو رہی تھی وہ کونسے لوگ تھے‘ وہ کس قسم کے لوگ تھے جن کے ساتھ ان کا واسطہ پڑا ہوا تھا۔

جنگ بدر میں ابوجہل کا سر

نہ جھکنے والے لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ بدر کے میدان میں دو لڑکے [1] چھاتی پہ بیٹھ کر ابوجہل کا سر کاٹنے لگے تو اس نے کہا کہ یہ گردن ذرا نیچے سے‘ یہاں سے‘ کاٹنا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں تو یہ ہڈیاں ہیں‘ اِن میں تو بڑی تکلیف ہوگی‘ تم یہ کیوں کہتے ہو؟ عزیزانِ من! ان کے ہاں یہ رواج تھا کہ میدانِ جنگ میں جو مرنے والے ہوتے تھے‘ ان کے سروں کو نیزے پہ ٹانگ کر‘ ان کا جلوس نکالا کرتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جب وہ جلوس نکلے گا تو میرا سر باقیوں سے اتنا اونچا نظر آئے گا۔ یہ تھی وہ قوم جس کے ساتھ انہیں پالا پڑا تھا کہ اُس وقت‘ خواہ میری ہڈیاں ہی کیوں نہ کٹ جائیں اور اتنی تکلیف ہی کیوں نہ ہو جائے‘ مرنے کے بعد اس جلوس میں میرا سر ذرا اونچا رہے۔ یہ سر اونچا رکھنے کی ذہنیت تو ان کے ہاں یہاں تک جاتی تھی۔ یہاں یہ کہا ہے کہ یہ کیفیت ہوگی جیسی وہ کشفِ ساق کی ہوتی ہے: میدانِ جنگ سے بھاگنے کی۔ مصیبتوں کا یہ عالم تھا اور اس پہ بھی اگر کوئی ان سے یہ کہتا تھا کہ اب بھی جھک جاؤ تو وہ کہتے تھے کہ نہیں بھئی! وہ بات ٹھیک ہے کہ آخری وقت میں ’’کیا خاک مسلماں ہونگے۔‘‘ [2] لیکن یہ ضد تھی‘ تکبر تھا‘ استکبار تھا۔ بالکل وہی جیسا کہ فرعون [3] کے معاملے میں قرآن نے کہا ہے کہ وہ لوگ دل سے مانتے تھے کہ حضرتِ موسیٰؑ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن وہ جو فرعونیت تھی‘ نخوت اور تکبر تھا‘ وہ سر نہیں جھکنے دیتا تھا۔ اور دوسری جگہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہوں نے پہلی دفعہ ہی‘ First Impression میں‘ یہ بات کہی کہ ہم نہیں مانتے تو پھر اس کے بعد ساری عمر یہی کہتے رہیں گے ’’ہم نہیں مانتے۔‘‘ اس لیے نہیں کہ اس کے بعد وہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی‘ مان تو جائیں گے کہ ٹھیک ہے لیکن وہ جو ایک دفعہ بات کہہ دی تھی اب اس بات سے ہٹنے میں اپنی بڑی ہزیمت محسوس کریں گے‘ ندامت محسوس کریں گے۔ یہ جو False

---

[1] یہ انصار کے دو نوجوان بھائی‘ معوذ اور معاذ‘ تھے۔ (حوالہ پرویزؒ: معراجِ انسانیت‘ ناشر ادارہ طلوعِ اسلام کراچی‘ ۱۹۴۹ء‘ ص۔ 524

[2] عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

[3] فرعون کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں۔ یہ قدیم شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ بنی اسرائیل‘ ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ‘ لاہور‘ 2004‘ ص۔ 109 (فٹ نوٹ نمبر 1)

Prestige کا' جھوٹی عزت کا' جسے قرآن عزت الاثم کہتا ہے اور یہ لوگ اسی بیماری کا شکار ہوتے ہیں' اگر یہ ذہنیت نہ بدلی جائے تو اگر وہ حق وصداقت کو ذہنی طور پہ سمجھ بھی لیں کہ یہ صحیح ہے کہ یہ جو تکبر برتری کا احساس ہوتا ہے یہ احساس جھکنے نہیں دیتا' تو کہا کہ وہاں کیفیت یہ ہے۔ وہاں معرکہ آرائی میں کیفیت کشفِ ساق تک کی آ جائے گی۔ کوئی مشورہ بھی دے گا کہ اب بھی یہ بات تسلیم کر لی جائے لیکن اس پر بھی وہ نہیں مانیں گے' جھکیں گے نہیں' وہ اس وقت بھی تباہی سے بچنے کا سامان نہیں کریں گے۔ یہ ہے فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ o خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ (68:42-43) کیفیت یہ ہے کہ شکست وندامت سے' آنکھیں جھکی ہوئی ہیں۔ جیسے یہ بھی محاورہ ہے جسے روسیاہی کہتے ہیں' جسے ندامت کی' شرم کی' چہرے پہ کالک ملی ہوئی کہتے ہیں: اس قدر ذلیل وخوار ہیں۔ وَ قَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سٰلِمُوْنَ (68:43) اُس زمانے میں جب ابھی انہوں نے یہ شکست نہیں کھائی تھی' یہ اس زمانے میں اچھے بھلے تھے۔ مہلت کے عرصے کے دوران ان کو دعوت دی جاتی تھی کہ صداقت کی طرف آ جاؤ' اسلام کی طرف آ جاؤ' اس وقت یہ نہیں مانتے تھے۔ اب بھی اسی نخوت کے جذبے کے ماتحت یہ کہتے ہیں کہ اب کیا ماننا ہے صاحب!

عرب قوم کی ذہنیت

عزیزانِ من! قومِ عرب میں جذبہ اصل میں تفاخر نسب کا جذبہ تھا۔ ان کے ہاں یہ جذبہ اس قدر ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا کہ ہماری تاریخ کے اندر درج ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے چچا ابو طالب تھے۔ مجھے فرقہ دارانہ بحث کرنے کی عادت نہیں ہے۔ میں کہہ یہ رہا ہوں' سنیوں کے ہاں کی تاریخ میں تو یہی ہے کہ وہ آپ کے چچا تھے۔ تعلقات ایسے تھے تو آخری وقت میں آپ ﷺ نے ان چچا سے کہا کہ ''میری زندگی تو آپ کے سامنے گزری ہے' آپ کے ہاتھوں میری پرورش ہوئی ہے' آپ جانتے بھی ہیں' میری جو دعوت ہے' اُسے بھی آپ جانتے ہیں۔ آخری وقت ہے اب تو اسے تسلیم کر لیجیے۔'' انہوں نے کہا کہ ''بیٹا! یہ ٹھیک ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ بات سچی ہے لیکن اگر اس وقت میں نے تسلیم کیا' قوم یہ کہے گی کہ موت سے ڈر کر ایمان قبول کر لیا' اس لیے جانے دو۔'' یہ چیز عین اس قوم کی ذہنیت کی ترجمانی کرتی ہے' اور آج بھی جو آپ کے ہاں بڑے بڑے پھنے خاں ہوتے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ دل سے وہ مانتے ہیں کہ ٹھیک ہے لیکن جھکنا نہیں چاہتے۔ اصل ذہنیت یہی ہے کہ جب یہ بات سمجھ میں آ جائے کہ وہاں صداقت موجود ہے تو پھر یہ جھوٹا فخر اور تکبر اس طرف نہیں آنے دیتا حالانکہ اس جھوٹے فخر وتکبر سے الگ ہٹ کر' اس حق وصداقت کے سامنے جھک جانا' ہی عین بزرگی اور عظمت ہے۔ یہ جو ان کے ہاں نسلی اور نسبی تفاخر کی ابتداء ہوتی تھی' یہ ان کے ہاں زندگی کے ہر شعبے میں سچ کے ماننے کے

راستے میں آڑے آتی تھی۔ آج بھی لوگوں کی وہی کیفیت ہوتی ہے۔

انہیں میرے حوالے کر دیجیے

رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا گیا کہ آپ ﷺ ان سے نہ گھبرایئے' آپ ﷺ اپنے پروگرام پر اسی طرح استقامت سے کارفرما رہیے' باقی رہے یہ تو ان کے لیے یہ ہے کہ: فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ (68:44) جو لوگ اس حق وصداقت کی تکذیب کرتے ہیں' انہیں میرے حوالے کر دو۔ اف میرے اللہ! عزیزانِ من! آپ سوچ لیجیے کہ جنہیں خدا کے حوالے کر دیا جائے تو پھر ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ''جنوں کیندے نیں: میں آپے سج لاں گا ایناں نال۔''[1] وہ میں خود ہی انہیں سمجھ لوں گا۔ یہ محاورہ ہے ''وہ سج لین گے جیہڑی گل ہے۔''[2] ''سمجھ لینے میں'' وہ بات نہیں بنتی۔ کیوں بیٹیو! ٹھیک ہے!! اور بات کہنے کا کیا انداز ہے کہ آپؐ اپنے پروگرام پہ چلے جایئے۔ ان کے متعلق Worry (فکر وتشویش) نہ کیجیے۔ انہیں میرے حوالے کر دیجیے۔ آپ سوچ لیجیے کہ جس مجرم کو خدا کے حوالے کر دیا جائے کہ آپ اس سے نمٹ لیجیے تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیا انداز ہے قرآن کے بات کرنے کا: انہیں میرے حوالے کر دیجیے صاحب! کیا کرونگا میں ان کے ساتھ؟ جھپٹ کر ٹینٹوا نہیں دبا دونگا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ قانونِ مکافات ہے جو بار بار ہمارے سامنے آتا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ہوتا ہے' قوموں کی روش کا نتیجہ اور غلط نظام کا نتیجہ سامنے آ کر رہتا ہے۔ لیکن یہ پہلے دن ہی سامنے نہیں آ جاتا' یہ آہستہ آہستہ' شروع میں' اس کے نتائج کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں' غلط نظام کے چھوٹے چھوٹے جھٹکے بھی آتے ہیں' وہ شیک (Shake) کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ اب بھی سمجھ جائیں' اب بھی اصلاح کر لیں مگر وہ بتدریج بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ چیز فوری طور پر نہیں ہوتی۔ اسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ اس دوران میں اِدھر سے نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کو یہ تاکید ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ معاملات کا قطع تعلق بھی کر لو مگر قرآن کا پیغام پہنچاتے چلے جاؤ تاکہ یہ بات نہ ہو کہ کوئی اس لیے ہلاک ہو جائے کہ اس تک قرآن کا پیغام نہیں پہنچا تھا۔

عزیزانِ من! یہ جو مہلت کا وقفہ ہوتا ہے اس میں آہستہ آہستہ یہ قوم تباہی کی طرف جا رہی ہوتی ہے۔ قرآن کا پیغام پہنچانے والوں کی ذمہ داری ہے کہ اس زمانے میں بھی ان تک پیغام پہنچاتے رہیں۔ ممکن ہے سعید روحیں ایسی ہوں جو اس

---

[1] یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ پھر میں ان سے خود ہی نپٹ لوں گا۔

[2] وہ خود ہی نپٹ لیں گے۔ بات یہی ہے بس!

پہ آ جائیں اور تباہی سے بچ جائیں۔ اس میں خدا کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے' نہ ہی اس حق وصداقت والی جماعت کا فائدہ ہے کہ اس سے انہیں ووٹس زیادہ آ جائیں گے۔ جذبہ صرف یہ ہے کہ یہ تباہی سے بچ جائیں۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس پر بھی اِن سے معاشرتی قطع تعلق تو کرلو کیونکہ یہ ہیں ہی ایسے' لیکن اس کے باوجود قرآن کا پیغام پہنچاتے جاؤ تاکہ کوئی شخص اس لیے ہلاک نہ ہو جائے کہ اس کے کان تک حق کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ گویا مہلت کے وقفہ میں یہی مقصد ہوتا ہے: ممکن ہے یہ لوگ اب بھی سمجھ جائیں لیکن وہ نہیں سنتے' نہیں مانتے' ان کی ضد' ان کی نخوت' انکا تکبر اس پہ آنے نہیں دیتا۔ وہ اپنی غلط روش میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھر اس فریبِ نفس میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ''ہم اتنا کچھ کرتے ہیں' یہ کہتے ہیں تباہ ہو جائے گا' ہمارا تو کچھ بگڑ ہی نہیں رہا۔'' اس میں بھی انکو مغالطہ لگ جاتا ہے۔

درجہ بدرجہ تباہی کی طرف

یہ جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتے چلے جانا ہے اس کے لیے قرآن کی لفظی ندرت کاریوں کو بھی یہاں دیکھیے۔ اس کے لیے ایک لفظ ہے۔ یہاں کہا تو یہ ہے کہ ان کو میرے حوالے کردو' میں ان سے نمٹ لوں گا لیکن میں نے کہا ہے کہ اس کی طرف بتدریج آنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے یہ ایک لفظ ہے۔ اسے بھی آپ جلدی سے نہیں بول سکتے۔ اس میں بھی درجہ بدرجہ قدم بقدم آگے آنا پڑتا ہے۔ یہ لفظ ہے: سَنَسْتَدْرِجُهُمْ (68:44)۔ یہ ہے قرآن کا اسلوبِ بیان۔ یعنی یہ لفظ ایسا نہیں ہے کہ آپ یوں جھٹکے سے آگے بڑھ جائیں۔ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے' اس کا ایک ایک حرف آپ کو بولنا پڑتا ہے۔ یہ لفظ درجہ بدرجہ بولنا پڑتا ہے تو پھر اس کے معنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لفظ کو بولتے ہوئے بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ درجہ بدرجہ کی بات ہے۔

عزیزانِ من! اسے پھر سن لیجیے۔ کہا کہ فَذَرْنِیْ وَ مَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ (68:44) میرے حوالے کردو۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ (68:44) میں انہیں بتدریج لیتا چلا آونگا۔ کہاں سے لیتا چلا آؤں گا؟ کہا کہ مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (68:44) وہاں سے پھر تباہی آئے گی جس کو یہ جانتے بھی نہیں ہیں کہ کدھر سے آیا کرتی ہے لیکن اسی طرح درجہ بدرجہ آئے گی' بتدریج آئے گی' یکلخت نہیں آئے گی۔ یہی ہوتا ہے کہ غلط نظام کی تباہی آخرالامر بتدریج آتی ہے۔ یہ ان چیزوں کا Cumulative Effect (مجموعی اثر) ہوتا ہے' یہ کچھ اسی دن' اسی وقت' اسی جھٹکے میں نہیں ہو جاتا۔ یہ عمل سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (68:44) ہوتا ہے۔ کیا بات ہے! پھر کہا کہ وَ اُمْلِیْ لَهُمْ (68:45) مہلت اور رسی دراز کردو' مہلت کا وقفہ اور لمبا کردو۔ یہ نہ سمجھو کہ ہماری ناکامی ہے بلکہ یہ سمجھو کہ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (68:45)

میری تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وقفے کے وقت سے یا لمبے عرصے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے۔

نبی کی دعوت بلا معاوضہ

اسے قرآنِ کریم نے اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ (68:45)۔ کہا ہے۔ یعنی ہماری تدبیر بڑی محکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ تم اس کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ اس طرح سے جو تم سے بھاگ رہے ہیں تو اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ (68:46) کیا تو اپنی تبلیغ کا ان سے کچھ معاوضہ مانگتا ہے کہ یہ اس کو بیگار سمجھتے ہیں' جرمانہ سمجھتے ہیں' اور تم سے بھاگتے ہیں؟ عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے کہ خاص طور پہ سورۃ ھود میں انبیاء کرام کی جو اتنی داستانیں آئی ہیں' ان میں ہر نبی کی پہلی پکار یا پہلی دعوت یا پہلے الفاظ یہ ہوتے تھے: اُعۡبُدُ اللّٰهَ (11:50,61,84) محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔ اگلے لفظ ہوتے تھے کہ میں اس کے لیے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ ہر نبی اپنی قوم سے پہلا فقرہ یہ کہتا تھا۔ تو اس سے نظر آیا کہ یہ کتنی اہم بات ہے جو کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ تمہارے لیے اتنی مشقت اٹھاتا ہے۔ انسان ذرا سا بھی ضد اور تعصب سے ہٹ کر سوچے۔ اس کے اخلاق پر تو نگاہ رکھو۔ اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے لیے اتنی مصیبت اٹھا رہا ہے۔ اوسوچ تو لیجیے کہ یہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اسی لیے تو پچھلی آیات میں آیا تھا کہ وہ کہتے تھے: پاگل ہو گیا ہے۔ وہ ٹھیک ہے کہ اِس سے اِسے کچھ نہیں ملتا مگر پھر بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں لونگا۔ مشقتیں اٹھا رہا ہے' گھر سے کھا رہا ہے' مار پڑ رہی ہے' گالیاں پڑ رہی ہیں' اور اس میں کوئی نظر ہی نہیں آتا کہ اسے کوئی منفعت بھی ہو' اس کا کوئی فائدہ بھی ہوتا ہو۔ تو انہیں یہ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار' اس قسم کے دیوانوں پہ ہزار فرزانگیاں نچھاور ہو جاتی ہیں۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا کہ اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ o اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ o اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَیۡبُ فَهُمۡ یَكۡتُبُوۡنَ (68:45-47) نظر آ رہا ہے کہ یہ تباہی کی طرف جا رہے ہیں' تو کیا ان کے ہاں کوئی ایسی کتاب رکھی ہے جس میں غیب کا علم ہے کہ وہاں سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ کامیابیاں' سرفرازیاں اور خوشگواریاں ہمارے ہی لیے لکھی ہوئی ہیں؟ اب دیکھیے کہ یہ جو بات بتائی کہ اگر ذرا بھی آنکھیں کھول کر دیکھیں تو نظر آ رہا ہے کہ یہ تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ غیب نہیں ہے۔ غیب تو آنکھوں سے پنہاں کا نام ہے۔ یہ شہود میں ہے' یہ چیز سامنے نظر آئے گی۔ وہ نظر آ رہی ہے کہ غلط نظام تباہی کی طرف جاتا ہے۔ غلط نظام کی کونسی بات ہے جو سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ ''غلط نظام ہے' تباہی کی طرف جا رہا ہے۔'' تو بس یہی ہے کہ غیب سے کوئی ایسی بات ان کے پاس ہو جو انہیں بتائے کہ نہیں' یہ جو کچھ کہہ رہا ہے غلط

ہے' آخرالامر کامیابیاں ہمارے حصے میں آئیں گی۔ کیا ان کے پاس کوئی غیب کی کتاب ہے جو یہ بتا رہی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن جو کچھ ان لوگوں کے متعلق کہتا تھا' اُس سب کا اطلاق آج ہمارے اوپر ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے بیماری آتی ہے' تدبیر کرنی ہے' علاج کرائیے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی پھر یہ حضرت صاحب کے پاس بھی جاتے ہیں' پوچھتے ہیں کہ حضرت صاحب! کیا یہ اچھا ہو جائے گا۔ غیب کی پوچھتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہم نے بھی اس قسم کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں' ہم حضرت صاحب سے ہر بات کے متعلق پوچھتے ہیں' اور خدا یہ کہتا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں' حتیٰ کہ اس کے رسول کو بھی نہیں۔ اسے بھی اتنا ہی معلوم ہوتا ہے جتنا وحی کے ذریعے اسے بتایا جاتا ہے' اس سے زائد بالکل نہیں۔ ان کے متعلق ہم رات کو جا کے پوچھتے ہیں۔ کیا انہوں نے چھپا کر کوئی کتاب رکھی ہوئی ہے؟ اُسے دیکھتے ہیں' اس میں سے فال نکالتے ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ فال نکالتے ہیں' استخارے کرتے ہیں' حضرت صاحب سے پوچھتے ہیں' غیب کی بات کو شہود میں لاتے ہیں' جو سامنے ہے اسے تو وہ نظر نہیں آتا' اس سے تو آنکھیں بند کرتے ہیں اور غیب کے متعلق اِدھر اُدھر سے مختلف غلط قسم کی بیان بازی کرتے رہتے ہیں۔ کہا کہ یہ سارا کچھ کر رہے ہیں' ہمیں اس کا پتہ ہے۔ تو ان کی کسی بات کی پرواہ نہ کر۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (68:48) ان تمام چیزوں کو برداشت کرو' استقامت سے اپنے پروگرام کے لیے جمے رہو اور خدا کے فیصلے کا انتظار کرو' وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ (68:48)۔ [1]

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ استقامت سے جمے رہو۔ جتنے انبیاء کرامؑ ہیں ان کی داستانوں میں حضرتِ یونسؑ ایسے ہیں جہاں ان سے ایک تھوڑی سی اجتہادی غلطی ہوگئی تھی۔ معاف رکھیے' یہ معصیت نہیں تھی' خدا کے حکم کی نافرمانبرداری نہیں تھی' ایک فیصلے کی غلطی تھی۔ ہر رسول کے ضمن میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ جس قوم میں پیدا ہوتا ہے' وہیں اپنے تعلیم کے سلسلے کے مشن کی ابتداء کرتا ہے' اسے جاری رکھتا ہے' پھر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس معاشرے میں جتنی سعید روحیں ہوتی ہیں وہ ان کے ساتھ ہو جاتی ہیں' حق وصداقت قبول کر لیتی ہیں اور باقی صرف اندھی مخالفت میں ہی مصروفِ کار رہتی ہیں' چنانچہ یہ نظر آتا ہے کہ جہاں اب اس انقلاب کے بارآور ہونے کی کوئی امید نہیں ہے تو پھر اس وقت وہ نبی خدا کے حکم سے اپنی جماعت کو لے کر اُس مقام سے کسی دوسرے مقام کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اس کے اس پروگرام کی کامیابی کے امکانات

---

[1] اور مچھلی والے پیغمبر (یونسؑ) کی طرح جلد بازی نہ کر۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے ہجرت کہتے ہیں۔ یہ مکان ہی چھوڑنا نہیں ہوتا' سب کچھ چھوڑنا ہوتا ہے۔ پھر یہ وہاں چلا جاتا ہے لیکن یہ جو وقت متعین کرنا ہے وہ خدا کے حکم سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ ادھر چلا جائے۔ حضرتِ یونسؑ کے قصے میں ایک بات ہے کہ ان کی قوم جب مخالفت میں انتہا تک پہنچ گئی تو انہوں نے ازخود فیصلہ کرلیا اور اس قوم کو چھوڑ کر وہ وہاں سے نکل گئے اور پھر آگے وہ قصہ ہے کہ وہ دریا میں مصیبت میں پھنس گئے' کشتی میں سے دریا میں گر گئے تھے' مچھلی نے ان کو اپنے منہ میں لے لیا تھا' نگل نہیں لیا تھا' وہ بات نہیں ہے۔ جب وہ سورۃ سامنے آئے گی تو میں عرض کرونگا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ جو کہتے تھے کہ پھر وہاں انہوں نے تسبیح پڑھی کہ لَآ اِلٰـہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ❶ (21:87)۔ وہ جو سورۃ الصفت میں (37:143) میں مسبحین کا لفظ آیا ہے تو اس میں قرآن نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں: ''تیراک ہونا۔'' مَسَبِّحُوْنَ کے معنی ہوتا ہے: ''بہت تیزی سے تیراکی۔''

پورا ہاتھ پھیلا کر جو تیراکی ہوتی ہے' اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں یہ تسبیح بن گئی ہے' جو دانوں پہ کرتے ہیں۔ تو وہاں یہ بات ہوئی ہے کہ اس حضرت یونسؑ نے ہمت کی' وہ مچھلی کے منہ سے نکل آئے۔ اس نے انہیں نگلا نہیں تھا۔ وہ مچھلی کے صرف منہ میں ہی تھے۔ اگر وہ اتنے تیراک نہ ہوتے تو وہ قیامت تک وہیں رہتے' مچھلی ان کو کھا جاتی۔ جب وہ مچھلی کے منہ سے نکل آئے تو پھر دریا کی ایک موج نے ان کو لبِ ساحل الٹ دیا۔ وہ خشکی کے اوپر آ گئے لیکن جو حالت ہو سکتی تھی' وہ ظاہر ہے: دریا میں غرقابی کی کیفیت' مچھلی کے منہ میں' پتہ نہیں وہ کتنی بڑی وہیل جیسی مچھلی ہوگی' اس سے چھٹکارا' پھر اس کے بعد تیر کے باہر آنا' تو وہ نیم مردہ سے ہو رہے تھے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ وہاں ایک بیل تھی' وہ اس کے سائے میں آ گئے۔ وہاں یہ بات کی گئی کہ انہوں نے کہا کہ میں نے وہاں سے آنے کا غلط اندازہ لگایا۔ وہاں یہ کہا گیا کہ اگر تم تھوڑا سا بھی انتظار کر لیتے تو وہ پوری کی پوری قوم ایمان لے آتی۔ اس کی تو یہ کیفیت ہوگئی ہوئی تھی۔ ''اوتے جس طراں دم دِتے ہوئے چاول ہوندے نیں نا بس وہ ایک کنی باقی ہوتی ہے۔'' ❷ تو کہا کہ وہاں تو ان کی یہ کیفیت ہوگئی تھی اور تم جی چھوڑ بیٹھے' دلبرداشتہ ہوگئے' اور خود ہی وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ فیصلہ غلط تھا' چلو جاؤ' وہاں جا کے ان سے پروگرام بناؤ۔ یعنی یہ ایک واقعہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے یہ کہا گیا ہے کہ انبیائے سابقہ نے جو کچھ کیا' اسی طرح سے تمہیں بھی ثابت قدم رہنا ہوگا'

---

❶ بارِالٰہا! تیرے سوا اور کسی کو اس کا اقتدار و اختیار نہیں (کہ وہ مجھے ان مشکلات سے نجات دلا سکے) میں نے جو اس فیصلے میں عجلت کی اور تیرے حکم کا انتظار نہ کیا تو میری زیادتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا فیصلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو ہر قسم کے عیب سے پاک ہوتا ہے۔

❷ جس طرح دم دیئے چاول ہوتے ہیں' ان میں تو صرف معمولی سی سختی رہ گئی تھی۔

استقامت پہ رہنا ہوگا' یہ کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے' گھبراؤ نہیں' انجامِ کار کامیابی تمہاری ہوگی لیکن اس میں حضرت یونسؑ کی ایک استثنٰی ہے۔ حضرتِ یونسؑ سے جو قبل از وقت گھبرا کر یا دلبرداشتہ ہوکر' یا مایوس ہوکر' جو بھی جی میں آئے کہیے' وہ قبل از وقت وہاں سے چلے آئے تھے۔ کہا کہ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ (68:48) استقامت سے جمے رہو۔ ہم جانتے ہیں کہ بڑی شدید مخالف اور مخاصمت ہے' خدا کے حکم کا انتظار کرو' صاحبِ حوت (حضرتِ یونسؑ) کی طرح نہ ہو جانا۔

یہ معصیت نہیں تھی

عزیزانِ من! حوت مچھلی کو کہتے ہیں۔ اسی لیے حضرتِ یونسؑ کو مچھلی والا پیغمبر بھی کہتے ہیں۔ کہا کہ اس کی طرح نہ کر دینا' جلد بازی سے کام نہ لینا' دلبرداشتہ نہ ہو جانا۔ اس (حضرتِ یونسؑ) کی کیفیت تھی کہ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ o لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ مَذْمُوْمٌ (68:48-49) اگر پھر خدا کی یہ عنایتیں اس کے ساتھ نہ ہوتیں تو وہ اپنے ایک غلط فیصلے کی رو سے ختم ہو گیا ہوا تھا۔ وہ تو یہ تھا کہ چونکہ وہ معصیت نہیں تھی کہ جس کی سزا دینی مقصود تھی' صرف ایک اجتہادی غلطی تھی تو پھر اس کے بعد یہ ساری چیزیں ایسی آتی رہیں جس سے اس کی حفاظت ہوگئی' پرورش ہوگئی۔ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (68:50) سرکشی اور معصیت نہیں تھی اس لیے اس کے خدا نے اس کا انتخاب کیا' وہ نبی تھے' نبی رہے' خدا نے ان کو صالحین میں سے بھی کہا' لیکن وہ جو ایک چیز تھی کہ قبل از وقت فیصلہ کیا' دلبرداشتہ ہو گئے' استقامت چھوڑ دی' اس لیے آپ ﷺ سے یہ کہا ہے کہ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ [1] (68:48)۔ عزیزانِ من! اس پروگرام میں آپ اندازہ لگائیے کیا مقامات آتے ہیں کہ خدا کا یونسؑ جیسا' ایک نبی بھی' گھبرا کر وہاں سے' وہ جگہ چھوڑ کے' ہجرت کر بیٹھتا ہے۔

خدا کی طرف سے رسول خدا ﷺ کو بار بار صبر کی تاکید

رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ ایسا نہ کرنا' انہیں برداشت کیے جاؤ۔ ان کی برداشت کی بھی بڑی انتہا تھی اگر ہم حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کی مکہ کی زندگی دیکھتے ہیں تو آج بھی اس کے پڑھنے سے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں'

---

[1] تو ان کی کسی بات کی پرواہ نہ کر' اور اپنے نشو ونما دینے والے کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل میں ثابت قدم رہ۔ اور مچھلی والے پیغمبر (یونسؑ) کی طرح جلد بازی نہ کر۔ وہ اپنی قوم کی مخالفت سے گھبرا کر وقت سے پہلے ان سے ہجرت کر کے چلا گیا (37:139 ; 21:87)۔ اِس سے وہ خود مشکل میں پھنس گیا اور غم والم کی اس حالت میں اس نے ہمیں مضطربانہ پکارا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کیا تھی برداشت کی قوت! حضورﷺ کے تو بہر حال یہ انداز تھے ہی' آپ کے جو ساتھی تھے' ان کی بھی کیفیت یہ ہے۔ تو یہ کہا گیا کہ برداشت کیے جاؤ' ہمت سے کام لو' استقامت سے کام لو۔ آپ اس سے سمجھ لیجیے کہ ہم جو پیدائشی مسلمان ہو کر سمجھ رہے ہیں کہ ہم اس حبیب کی امت میں سے ہیں' اس کی شفاعت سے بخشے جائیں گے' تو کیا یہ درست ہے جب کہ اس طرح کے سنگین مراحل نبیوں اور ان کے صحابہ کے ساتھ پیش آئے۔ ہمیں تو اس میں کوئی بھی ایسی منزل پیش نہیں آتی' کہیں بھی کوئی آزمائش نہیں ہوتی' کوئی کسی قسم کی بھی مصیبت نہیں آتی مگر ان منازل سے گزرنا پڑتا ہے:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مسلمان ہونا آسان نہیں ہے۔ مسلمان کہلانا تو بڑا ہی آسان ہے' اس میں تو کچھ بھی نہیں لگتا: نہ ہینگ نہ پھٹکڑی۔ وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ ❶ (68:51)۔

آپﷺ کی ذات پر طعن و تشنیع کے خنجر

عزیزانِ من! یہ جو تیغ و سناں کے کچوکے یا زخم ہوتے ہیں' ان میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی طعن و تشنیع کے خنجر سے ہوتی ہے۔ مرنے والا تو فقط بات سے مر جاتا ہے۔ یہ ان حربوں پر بھی اتر آتے تھے اور قرآن نے بات بھی یہی کہی ہے کہ ان کی جو باتیں ہیں ان سے یہ صورت ہوگی۔ کہا: جس انداز سے یہ تمہیں دیکھتے ہیں' ہمیں معلوم ہے کہ تم پہ اس سے بھی کیا گزرتی ہے۔ اس قوم کی عجیب چیز نظر آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرف تو ان کی یہ اس قسم کی جرأتیں اور بصالتیں ہیں کہ دشمن بھی نکھرے ہوئے کھلے طور پر ہیں اور دوسری طرف اِن میں اس قسم کے بھی لوگ تھے جو طعن و تشنیع بھی دیں اور کمینی حرکتیں بھی کریں۔ وہاں مختلف قبائل کا ذکر ہے' اس کے اندر یہودیوں کا بھی ہے' جنہیں منافقین کہا گیا ہے کہ وہ ان حربوں پر بھی اتر آئیں کہ طعن و تشنیع بھی دیں اور کمینی حرکتیں بھی کریں اور پھر' جیسے یہاں کہا گیا ہے کہ اس قسم کی نگاہوں سے دیکھیں کہ اس سے جگر شق ہو جائے۔ کہا کہ یہ بھی کوشش کریں گے اور یہ ساری بات اس لیے کریں گے کہ تم اپنے مقام سے ذرا

---

❶ اِن کفار کی کوشش یہ رہتی ہے کہ جب وہ تم سے قرآن سنیں تو تمہیں (کبھی) دیوانہ کہہ دیں' (اور کبھی ساحر اور شاعر) اور تمہاری طرف گھور گھور کر دیکھیں تاکہ تم ان سے زچ پڑ جاؤ اور اس طرح اپنے مقام سے پھسل جاؤ۔

پھسل جاؤ۔

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں ان کے متعلق یہ ہے کہ یہ کوشش کرتے تھے کہ کچھ Compromise (مفاہمت) کی شکل نکل آئے' یعنی پہلے پورا زور لگا لیا کہ شکست دیدیں۔ وہ نہیں ہو سکا تو پھر ان منافقین کا اگلا حربہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مفاہمت پہ آ جائیں۔ جو حق پر ہوتا ہے وہ کسی سے مفاہمت کے لیے کچھ کہنا تو ایک طرف' وہ تو مفاہمت پہ آتا بھی نہیں' وہ آ سکتا ہی نہیں ہے چہ جائیکہ وہ دوسرے سے کہے کہ آیئے کچھ Compromise (مفاہمت) کر لیں۔ یعنی کچھ تم جھکو کچھ میں جھکتا ہوں' کچھ تم پیچھے ہٹو کچھ میں آگے بڑھتا ہوں۔ یہ وہی کرے گا جو حق پر نہیں ہوگا۔ یہ جو مصالحتی اسلام ہے' یہ وہی ہے' جسے نظریہ ضرورت کا اسلام کہا جاتا ہے۔ وہ Compromise (مصالحت) ہے۔ جو حق پر ہے وہ مصالحت نہیں کر سکتا۔ وہ تو جان دیدیگا لیکن دو اور دو پانچ نہیں کہے گا۔ غور فرمایئے قرآن ان مقامات کو اتنی اہمیت دیتا ہی اس لیے ہے۔ یہ تو ہمارے لیے ہے۔ یہ اس زمانے کی صرف کوئی داستان نہیں بیان کر رہا۔ یہ صرف تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ اس نے یہ کہا' اس نے وہ کیا اور پھر آگے بڑھ گئے کہ ہمارا تو اس میں کچھ واسطہ نہیں ہے' طالبعلم ہے تو اتنا ہی واسطہ ہے کہ امتحان میں سوال آئے گا تو مجھے جواب دینا ہوگا' ہمارا ان چیزوں سے تعلق نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔

باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں ہو سکتی

یہ قرآن ہمارے لیے ہے اور وہ یہی ہے کہ جو حق پر ہے وہ Compromise (مفاہمت) پہ نہیں اتر سکتا' وہ مفاہمت نہیں کر سکتا' اس کے دل میں مفاہمت کا تصور بھی نہیں آ سکتا۔ سوال ہی نہیں کہ پھر وہ گفت وشنید پر اتر آئے۔ اگر وہ حق پہ ہے تو اس کا اس چیز پر آنا ہی نہیں۔ وہ تو اس کے لیے آپ کو دعوت دیتے تھے کہ آیئے آپ اور ہم مفاہمت کر لیں۔ یہی بات قرآن کہتا ہے کہ ان کے باطل پر ہونے کے لیے یہی ایک ہی دلیل کافی ہے کہ وہ خود کہہ رہے ہیں کہ ہم اپنے مقام سے ہٹتے ہیں۔ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں پڑ سکتی کہ ہم اپنے مقام سے ہٹتے ہیں۔ ویسے تو یہ ان کی شکست ہوتی ہے مگر یہ نہیں کہتے کہ ہم غلطی پر تھے۔ کہا کہ جب تو مفاہمت کی اس بات پہ بھی نہیں آتا تو پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہو گیا ہے' یہ کسی کی مانتا ہی نہیں ہے۔

ضد میں اور اصول پرستی میں فرق

اب جیسا میں نے پچھلی دفعہ' اس سے پہلے درس میں' بھی عرض کیا تھا کہ ضد میں اور اصول پرستی میں ایک فرق ہوتا

ہے۔ضدی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ حق پر ہی ہو تو اس پہ اڑا ہوا ہو' وہ تو اپنی ہر بات پر اڑا رہتا ہے۔اپنی قوت کے زعم پہ اڑا ہوا ہوتا ہے۔تکبر اور استبداد کی ذہنیت کی بناء پہ' اپنی ہی بات پہ اڑا ہوتا ہے۔ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ حق پر ہو۔ اصول پرست وہ ہوتا ہے جو سمجھنے سوچنے کے بعد حق کو قبول کرے اور پھر اس پر جم کر کھڑا ہو جائے۔

پرواز میں کوتاہی کا سبب کیا ہوتا ہے؟

یہ جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا [1] (41:30)۔عزیزانِ من! وہ سب کچھ سمجھنے سوچنے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ روٹی کسی انسان کے ہاتھ سے نہیں لی جائے گی' وہ ذلت ہے' اس سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے' وہ اس نتیجے پہ پہنچ کر اس کو اپنا ایمان بنا لیتے ہیں۔اس کے بعد کہا ہے کہ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے ہیں۔آگے آتا ہے کہ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔انہوں نے صرف ایمان لانے کے اوپر ہی اکتفا نہیں کیا' ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) بھی ساتھ کہا ہے۔

ایسا انسان خدا کا مہمان ہوگا

عزیزانِ من! استقاموا کے بعد بڑی بڑی رکاوٹیں' تصادمات اور تزاحمات آئیں گے' کشمکش ہوگی' مصیبتیں آئیں گی' مشکلات آئیں گی پھر اس وقت اس پر جم کر کھڑے ہو جانا۔ یہ ہے وہ مقام جہاں قرآن کہتا ہے کہ ان پر ملائکہ کا نزول ہوگا جو اس بات کی بشارت دیں گے جو تمہارے لیے خدا نے پہلے سے ہی تیار کر رکھا ہے۔تم تو خدا کے مہمان ہو گئے ہو' اس نے مہمانوں کی تواضع کے لیے بڑے حسین و شاداب سامان تیار کر رکھے ہیں وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (41:30) اِس استقامت سے تمہارے لیے اس جنتی معاشرے کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مقام تو اس وقت آتا ہے جب آپ پہلے حق و صداقت کو اس طرح قبول کریں کہ اس سے دل اور دماغ کا اطمینان ہو جائے پھر اگلا مرحلہ اس حق و صداقت پر چلنے کا آتا ہے' ورنہ صبح کو آپ نے بات کی' شام کو پھر گئے۔ یہ شیوہ ان لوگوں کا ہے جن کو پتہ نہیں کہ ایمان اور یقین کسے کہتے ہیں۔

---

[1] جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا' اللہ ہے۔اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔

آپ ﷺ کی ذات کے متعلق کفار کا ناکام تجسس

عزیزانِ من! جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ [1] پٹتا ہے' ماریں کھاتا ہے' گالیاں سہتا ہے' سب کچھ برداشت کرتا ہے مگر اس کا کچھ معاوضہ نہیں مانگتا۔ وہ تجسس کے بعد' سراغ رسانی سے بھی' دیکھتے ہونگے کہ کوئی کسی قسم کا' غائبانہ ہی' کوئی تو اس کا مفاد ہوگا۔ جب کچھ نظر نہیں آتا' تو ایک تو اِس مقام پہ وہ کہتے تھے کہ ''پاگل ہے جسے اپنے نفع نقصان کی بھی پرواہ نہیں۔'' یہاں دوسری بات یہ ہے کہ ہم اسے Compromise (مفاہمت) کے لیے کہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم یہ لڑائی بند کر دیں گے' یہ کشمکش ختم ہو جائے گی' یہ مصیبتیں اور ان مصیبتوں کے یہ مرحلے تمہارے سامنے سے ختم ہو جائیں گے' مگر اس پہ بھی یہ کہتا ہے کہ ''نہیں صاحب! میں تو یہ نہیں چھوڑ سکتا' میں اس پہ ذرا بھی Compromise (مفاہمت) نہیں کر سکتا' تو جیسے ہم کہتے ہیں کہ وہ یہی کہہ کے اٹھ گئے ہونگے کہ یہ بڑا ہی ضدی ہے۔ اس کے لیے تو پھر ان کے ہاں وہی لفظ ہے کہ بالکل مجنون ہے' پاگل ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد اگلی وہ بات آئی جس پر اِس سورۃ کا خاتمہ ہوتا ہے۔

سورتوں کے آخر میں فکرِ قرآنی کا نچوڑ ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ سورتوں کی جو آخری آیات ہوتی ہیں' ان میں اس پیغام کا جو اس سورۃ کے اندر دیا جاتا ہے ایک نچوڑ دیا ہوتا ہے۔ یہ ساری کشمکش وہاں ہوئی' یہ سب کچھ آیا' یہ قوم نہیں مان رہی' آخر تک زور لگا دیا' پھر یہاں آ گے مایوسی کی بات ہوتی ہے کہ میں ناکام رہ گیا۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں یہ نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! دیکھیے کہ یہاں کس بات کا اطمینان دلایا جاتا ہے۔ کہا کہ تمہارا یہ پیغام' تمہارا یہ مشن اسی رقبے' اسی وطن' اسی ملک' اور اسی قوم کیساتھ محدود نہیں ہے وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (68:52) یہ تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اگر یہ لوگ یہاں نہیں مانتے تو اپنا نقصان کر رہے ہیں' اس مشن کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ وہ تو وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''پوری روئے زمین میری مسجد ہے۔'' تم نہیں تو ملکِ خدا تنگ نیست' اور مقام ہونگے اور قوم آ جائے گی' وہ اِسے تسلیم کر لے گی۔ تو غم تو اس کو ہونا چاہیے جس کے لیے یہ ہو کہ ''یہی چار گاہک تھے یہ دوکان سے مڑ گئے تو اس کے بعد یہ سودا کیسے بکے گا۔'' سودا بیچنے کی تو بات ہی نہیں ہے' تم تو ان کے بھلے کی بات کہہ رہے تھے' اگر یہ نہیں مانتے تو کوئی بات

---

[1] اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

نہیں۔ یہ ''ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ'' (68:52) بڑی عظیم چیز ہے۔

انسانوں کے لیے دیا گیا نظام خداوندی کبھی فیل نہ ہوگا

قرآن کے خدا کا تصور رب العٰلمین کا ہے' یہ کسی ایک قوم کا' کسی گروہ کا' کسی جماعت کا' کسی نظام کا' کسی فرقے کا' کسی پارٹی کا رب نہیں' یہ تمام نوعِ انسانی کا رب ہے۔ اس کا رسول ''رحمت للعٰلمین'' ہے' یہ کسی ایک جماعت کے لیے رحمت نہیں' وہ تمام اقوامِ عالم کے لیے رحمت ہوگا۔ اس کا قرآن ''ذکر للعٰلمین'' ہے۔ اب ''ذکر'' کے معنی اگر Guidance یا راہنمائی یا یاد دہانی کے ہیں تو وہ بھی لیجیے اور عربی زبان میں اگر ذکر کے معنی شرف اور عزت یا رفعت (16:43; 68:50) کے ہیں تو یہ معنی لیجیے تو یہ پوری انسانیت کے لیے باعث عزت افزائی ہوگا' باعثِ شرف ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اگر یہ مخاطب قوم اس کی مخالفت کرتی ہے' اسے تسلیم نہیں کرتی تو اس سے یہ نظام فیل ہو جائے گا' یہ پیغام ناکام رہ جائے گا' قطعاً نہیں۔ یہ یہیں قومِ مخاطب کے لیے نہیں ہے' یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے اور پھر نوعِ انسانی تو قیامت تک کے لیے ہے۔

عزیزانِ من! ختمِ نبوت کے بھی معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد اور کوئی نبی بھی نہیں آئے گا۔ اگر نبوت کا اجراء رہے تو کچھ عرصے کے بعد پھر دوسرے نبی کی نبوت کا دَور شروع ہو جاتا ہے' ہوسکتا ہے اس کی قوم بھی دوسری ہو' ملک بھی دوسرا ہو' اپنی جماعت بھی دوسری ہو' لیکن جب نبوت کا خاتمہ ہوگیا تو پھر ختمِ نبوت کے بعد پیغامِ رسالت ہی باقی رہتا ہے۔ وہ پیغام غیر متبدل ہے' تمت ہے' مکمل ہے' محفوظ ہے۔ اب کوئی نبی بھی نہیں آئے گا جو دوسرا پیغام دے۔ اگر یہ تمہاری قومِ مخاطب اس کو اپنا کے اِسے عملاً متشکل نہیں کرتی تو اس نظام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ قرآن نے کئی مقامات پہ کہا ہے کہ اگر یہ نہ کرو گے تو یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ (47:38; 9:39) تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی اور وہ کہا ہے کہ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ (47:38) پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ یعنی یہ Substitution (استبدال) ایسا نہیں ہے کہ اسی قسم کی ایک دوسری قوم آ جائے۔

ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض

یہ جو بزورِ شمشیر یا قوت کے زور پہ مملکتیں حاصل ہوتی ہیں وہ تو جس قسم کی مستبد ایک قوم ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ مستبد دوسری قوم آتی ہے۔ وہ اس سے بہتر نہیں ہوتی لیکن وہ جو پیغامِ خداوندی کی رو سے بنتی ہے' جسے استخلاف فی الارض کہا

گیا ہے' جسے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض نصیب ہوتا ہے' وہ قوم اس سے بہتر ہوتی ہے جو اپنی سرکشیوں کی وجہ سے تباہ ہوئی ہے۔ یہ قوم جو اس کی جگہ لیتی ہے اسے کہا جائے گا کہ یہ اس سے بہتر قوم آئی ہے۔ اور یہاں کہا یہ ہے کہ پھر یہ سلسلہ اس طرح سے قیامت تک کے لیے جاری ہے۔

مسلمان حکومتوں کی حالت زار

یہ بات حقیقت ہے جو عام طور پر ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی بھی اتنی زیادہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اپنی چالیس سے بھی زیادہ آزاد مملکتیں ہیں لیکن ان تمام مملکتوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی دستِ نگر ہیں' ذلیل ہیں' محتاج ہیں۔ یعنی اِن کے ہاں ایسی دوہری غلامی ہے کہ جہاں اپنی حکومت ہے وہاں کی رعایا اپنے ہاں کے صاحبِ اقتدار حاکم کی غلام ہے اور یہ جو اپنے ہاں کے اتنے بڑے حاکم ہیں' وہ سپر پاورز کے غلام ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی ایک قوم بھی ایسی نہیں ہے' کوئی ایک مملکت بھی ایسی نہیں ہے کہ عام معیار کے مطابق ہی سہی' اس کا شمار سپر پاور میں ہی ہو جائے۔ جو مصیبت پڑتی ہے ان پہ آ کر پڑتی ہے' یہ اس کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔ زیادہ سے زیادہ یو این او (UNO) میں جا کے ایک ریزولیشن (Resulution' قرارداد) پاس کرا لیتے ہیں اور بس۔ ویٹو پاور دو ممالک [1] کو دی ہوئی ہے' وہ ویٹو پاور اسی وقت اس ریزولیشن کو مسترد کر دیتی ہے اور اسی طرح سے یہ اپنی جھولی خالی لے کر گھر واپس آ جاتے ہیں۔ یہ چیز کہ ان میں سے آج اسلام کسی کے ہاں بھی نہیں ہے صرف میرے کہنے کی بات نہیں ہے کہ میں فتوے لگاتا ہوں۔ یہ اظہر من الشّمس ہے۔

ایک محسوس ٹیسٹ

قرآن نے یہ کہا ہوا ہے کہ ''یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی غیر مسلم' مسلم جماعت پر غالب آ ہی نہیں سکتا۔'' یہ اتنا محسوس ٹیسٹ ہے کہ اس میں کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یعنی یہ کوئی Abstract Talk نہیں' فلسفے کا مسئلہ نہیں کہ بحثیں کر کے پتہ چلے کہ وہ غالب آئے ہوئے ہیں یا نہیں' یہ مسلمان ہیں یا نہیں۔ تو پھر جب ہمیں خود اقرار ہے کہ یہ تمام غیر مسلم اقوام ہمارے اوپر غالب ہیں تو پھر دو ہی باتیں ہونگی: یا تو معاذ اللہ یہ کہا جائے گا کہ خدا نے یہ ٹھیک نہیں کہا کہ غیر مسلم غالب نہیں آئیں گے' دیکھ لیجیے وہ آئے ہوئے ہیں۔ تو کیا آپ یہ مانیں گے؟ خدا نے یہ کہا ہے کہ ہم سے زیادہ وعدے کا سچا ہی

---

[1] یاد رہے یہ 11 نومبر 1983ء کو کہا گیا تھا جب یہ ویٹو پاور صرف دو ہی ممالک کو حاصل تھی۔

کوئی نہیں ہے۔ تو اس کا یہ وعدہ تو صحیح ہے اور سچا ہے۔ تو اگلی بات یہی ہے کہ اس نے کہا تھا کہ کوئی غیر مسلم مومنین کے اوپر غالب نہیں آ سکے گا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم مومن نہیں ہیں جو یہ ہم پہ غالب آئے ہوئے ہیں' کوئی تیسرا نتیجہ اس سے نہیں نکلتا۔ لیکن' عزیزانِ من! اسے کوئی تسلیم نہیں کرتا' اس لیے کہ اس طرح سے یہ پیدائشی مسلمان رہنا' مسلمان مر جانا تو بڑا آسان ہے' کرنا ہی کچھ نہیں پڑتا۔ اس جنت سے کس کا جی چاہتا ہے کہ وہ نکل جائے جو اتنی آسانی سے مل جائے۔

گداگری کا پیالہ

''بہشت فی سبیل اللہ ہم است'' جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے' خوش باش' موج کر' بہشت فی سبیل اللہ ہم است' اللہ واسطے بھی بہشت مل جاتی ہے۔ یہاں بھی جو کچھ لیتے ہیں بخشش کے طور پہ لیتے ہیں۔ گداگری کا وہ پیالہ ہاتھ میں لیے ہوئے پھر رہے ہیں۔ وہاں جا کر بھی جنت بخشیش میں ہی مانگتے ہیں: اللہ بخش دے گا۔ یعنی یہ بات ہماری زبان پہ ہے کہ ہم جنت بھی بخشیش میں ہی مانگتے ہیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ جنہیں جنت دی جائے گی' ان سے کہا جائے گا کہ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (46:14) یہ تمہارے حسنِ عمل کا نتیجہ ہے جو تمہیں دیا جائے گا' اور اس کے بعد کہا ہے کہ پھر اس جنت سے تم اس طرح نہیں نکالے جاؤ گے جس طرح تمہارا باپ باوا آدم نکالا گیا' تھا جیسے یہ کہتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ اُسے وہ جنت بخشیش میں ملی ہوئی تھی' اس کے عمل کا نتیجہ نہیں تھی' پھر اس سے ایک لغزش ہوئی اور وہ باہر آ گیا۔

لہو سے خریدی ہوئی جنت

عزیزانِ من! یہاں جو' ان کے لیے جنت ہے' اسی جگہ کہہ دیا کہ تمہیں اس سے نہیں نکالا جائے گا' اس لیے کہ تم نے اسے اپنے لہو سے خریدا ہے' ہم نے یہ تمہارے ہاتھ بیچ دی ہے اور ہم بڑے دیانتدار کاروباری ہیں۔ جو اس طرح سے ہم نے چیز بیچ دی ہے ہم اس کو واپس نہیں لیتے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (4:122) اس میں ہمیشگی ہے جو اس طرح سے جنت خریدی جائے گی۔ یہ ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (68:52) ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ''نہیں ہے کہ جو مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے والی قوم ہے' یہ انہی تک محدود ہے' اس سے آگے نہیں ہے۔'' یہ تو سوال ہی نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں بلکہ دو ایک مقامات پر آیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) اے وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو: ایمان لاؤ خدا پر۔ وہ تو ہم سے ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور صحیح ہے یہ مطالبہ۔ کیا کبھی ہم نے سوچا ہے کہ ہم ان چیزوں پر غور و فکر کے بعد ایمان لائے ہیں؟ قرآنِ کریم اس کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلے یہ کہہ کر پکارتا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) اوراس کے معنی یہی ہیں کہ وہ جو اپنے آپ کو بزعمِ خویش مسلمان سمجھتے ہو' مسلمان تو ہم اس کا ترجمہ کرتے ہیں' مسلمان کا لفظ تو قرآن میں نہیں ہے۔ وہاں تو یا مسلم ہے یا مومن ہے۔ کہا کہ جو بھی اپنے آپ کو یہ سمجھتے ہو۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ (4:136) او اللہ پر ایمان لاؤ۔ تم اللہ پر ایمان لا کے مسلمان نہیں ہوئے ہو۔ وہ تمہارے مسلمان ہونے کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قومی حیثیت سے ایک مسلمان قوم ہے مگر قرآن کی حیثیت سے یہ مومن تو نہیں ہے۔ تو وہ جو کہا گیا تھا کہ غیر مسلم تم پہ غالب نہیں آ سکیں گے' وہ مومنین کے لیے کہا گیا تھا۔ آج بھی یہ مسلمان جو پیدائشی ہے' قومی ہے' اگر قرآن کے مطابق ایمان لے آئے تو پھر دیکھیے واقعی کوئی غیر مسلم ان پر غالب نہیں آ سکتا کیونکہ یہ اور خدا پھر دونوں ایک طرف ہونگے اور بقیہ تمام دوسری طرف مدمقابل۔

عزیزانِ من! سورۃ القلم ختم ہوگئی۔ اگلے درس میں سورۃ الحآقۃ' 69 ویں سورۃ سے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے

قرآن کریم قوموں کے عروج و زوال کے اسباب بیان فرماتا ہے اور گزشتہ اقوام کے حالات بطور استشہاد پیش کرتا ہے کہ سابقہ اقوام کو ان ہی اصولوں کے مطابق عروج و زوال سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ عرب جن اقوام سے بخوبی واقف تھے ان میں سے ایک قوم عاد بھی تھی۔ سورہ ہود میں قوم عاد کے جرائم ومصائب اور حضرت ہودؑ کی تعلیم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد قرآن کریم صرف ایک آیت میں ان کی ذہنی پستی اور قلبی خباثت کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ:

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُواْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوُاْ رُسُلَهُ وَاتَّبَعُواْ أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ(11/59)-

یہ قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام و قوانین سے انکار کیا اور اپنے رسولوں کی دعوت سے سرکشی برتی لیکن (حیرت یہ ہے) کہ اپنے ان سرکش اور ظالم حکام کی اطاعت کرتے رہے جو عمداً حق کی مخالفت کرتے تھے۔

بعینہٖ یہی حالات آج ہم مسلمانوں کے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں۔ قرآن کی حکومت کے قیام اور قانون خداوندی کے اجراء سے اِبا کرتے ہیں لیکن جو بھی جابر اور ظالم حکمران برسراقتدار آیا، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے بالکل رضامند ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے انسان کی حکومت انسان پر مطلقاً حرام قرار دی ہے اور انسانوں کو قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں دیا۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّهِ (12/40)- حکومت سوائے اللہ تعالیٰ اور کسی کو زیب نہیں دیتی۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَداً (18/26)- اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین (قرآن مجید) کے مطابق زندگی بسر کرنے لگیں تو قرآن کے وعدہ کے مطابق وہ تمام اقوام پر غالب بھی ہوں گے اور دیگر تمام اقوام کے نگران بھی۔

مسلمانوں کا عروج و زوال ان کے دین اور نظام کے عروج و زوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں پر ہر حالت میں فرض ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کے ماتحت

زندگی بسر کریں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے مطلقاً گریز کریں۔ صدر اول میں مسلمانوں کے عروج کا راز بھی اسی میں مضمر تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو متمکن کیا اور اس کے ماتحت زندگی بسر کی۔ جب سے مسلمانوں نے دین خداوندی کو ترک کیا اسی دن سے ان پر زوال و ادبار کی ابتداء ہوگئی۔ زندگی کی جتنی پریشانیاں' برائیاں' معائب و اسقام ہوسکتے تھے وہ سب امت مسلمہ میں در آئے۔ نکبت و اخلاص' غربت و جہالت' محکومی و مسکینی' تملق و خوشامد' پریشانی و درماندگی' مسلمانوں کا شعار زندگی بن گئے لیکن سب سے بڑی لعنت اور مصیبت جس نے مسلمانوں کو بالکل تباہ حال اور برباد کر دیا وہ ان کا آپس کا افتراق تھا اور ہے جس نے ایک ہزار سال سے فرقہ بندی کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور روز بروز اس کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کا دشمن اور خون کا پیاسا ہوگیا ہے اور ایک دوسرے کو قتل تک کرنے سے گریز نہیں کرتا جو قوتیں اور صلاحیتیں مسلمان دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے' وہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو بنص صریح شرک قرار دیا ہے۔ ارشاد حضرت باری ہے۔

مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ o (30/31-32)۔

خدا کی طرف رجوع رکھو اور اس سے ڈرو' صلوٰۃ قائم کرو اور شرک کرنے والوں میں سے مت ہو جانا کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بہت سے گروہ ہو گئے اور ہر گروہ اپنے اس طریقہ پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور خود گروہ در گروہ ہو جانا شرک ہے جس سے اجتناب لازمی ہے اور قرآن کریم نے فرقہ بندی کو جو شرک قرار دیا ہے تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دین میں تو آخری سند (وحی الٰہی) قرآن کریم ہوتا ہے' جو اللہ کی کتاب ہے' لیکن فرقہ بندی کے بعد ہر شخص اپنے فرقہ کا پابند ہوتا ہے اور ہر فرقہ میں آخری سند وہ ذات ہوتی ہے جس کی نسبت سے وہ فرقہ بنتا ہے۔ اس لئے فرقہ بندی میں آخری سند قرآن کے ساتھ اس فرقہ کی منتسب الیہ ذات بھی شامل ہو جاتی ہے' اس لئے وہ فرقہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ایک دوسری جگہ ارشاد عالی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6/159)۔

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (ترجمہ مولانا اشرف علی)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضورﷺ کی تعلیمات کے مطابق تو ایک امت واحدہ بنتی ہے۔ یہ الگ فرقہ بنانے والے ایک متوازی دین کے متبع ہو گئے۔ اس لئے ان کا تعلق رسول اللہﷺ سے نہیں رہتا۔ تاکید مزید کے طور پر قرآن کریم نے سورہ آل عمران میں نہایت پرشکوہ الفاظ میں فرمایا:

وَاعْتَصِمُواْ بِحَبْلِ اللّهِ جَمِيعاً وَلاَ تَفَرَّقُواْ -(3/103)

تم سب مل کے قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رہو اور فرقوں میں تقسیم نہ ہو جانا۔

یہ وہ آیت کریمہ ہے جو ہمارے دین کی اساس محکم اور بنیان مرصوص ہے۔ اسی میں ہماری ترقی وعروج کا راز پنہاں ہے اور اسی سے خود دین کا استحکام وتمکن ممکن ہے۔ یہ حبل اللہ ہی وہ محکم سہارا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے جو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا اور یہ کسی مقام وزماں' قوم' خطہ سے مخصوص نہیں۔ ذہن انسان کے خودساختہ قوانین زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے فرسودہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضابطہ خداوندی ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے اور تمام حدود وقیود اور امتیازات سے ماورا اور بالاتر ہے۔ اس کے اصول وہ ابدی اور مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی کوئی ترمیم وتنسیخ نہیں ہو سکتی۔ اسی آیت مجیدہ پر ذرا سا غور کرنے سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت بہت پرزور' موثر اور اپنے مفہوم پر بہت اصرار کرنے والی ہے۔ آیت کا ایک حصہ اللہ پر دوسرا حصہ نبی پر مبنی ہے تاکہ اپنے مفہوم اور حکم پر سخت تاکید کر سکے۔ قرآن کریم کو تھامے رہو اور فرقہ بندی نہ کرو۔ آیت سے واضح ہے کہ فرقہ بندی صرف اس صورت میں ہوتی ہے' جب حبل اللہ چھوڑ دی جائے۔ جب تک اللہ کی رسی کو تھامے رہیں گے' فرقہ بندی نہیں ہو سکتی۔ فرقہ بندی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھنا محض اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ آیت کے الفاظ اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ فرقہ بندی سے بچنے کا واحد ذریعہ قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رکھنا ہے۔ اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح اور روشن ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق قرآن سے نہیں رہتا کیونکہ فرقہ بنتا ہی جب ہے کہ جب قرآن کو چھوڑ دیا جائے۔

ان تینوں آیات کریمات سے واضح ہوا کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ' اس کے رسول اور قرآن کریم میں سے کسی سے کوئی تعلق برقرار نہیں رہتا۔

قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی نہ صرف کفر اور شرک ہے بلکہ اس کا نتیجہ تباہی' بربادی اور رسوا کن عذاب ہے۔ سورہ آل عمران میں ارشاد گرامی ہے:

وَلاَ تَكُونُواْ كَالَّذِينَ تَفَرَّقُواْ وَاخْتَلَفُواْ مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُوْلَـئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌo (3/105)-

خبردار رہو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت آ جانے کے بعد

آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کرلیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

یہاں قرآن کریم نے اختلاف اور فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم قرار دیا ہے اور جو عذاب اس کے نتیجہ میں وارد ہوتا ہے اس کی مختلف شکلیں ہیں جو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہیں۔ بھوک' پیاس' تکلیف' خوف وحزن' خانماں خرابی' سب کے لئے قرآن کریم میں عذاب کا لفظ آیا ہے۔ قرآن کریم نے ان تمام سختیوں' تکلیفوں کے لئے جو فرعون کی قوم غالب نے اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا کر رکھی تھیں عذاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (20/47) سورہ بقرہ میں **مفلحون** کے مقابلہ میں **لھم عذاب عظیم** (2/7) لاکر واضح کر دیا کہ عذاب کے ملنے سے زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی و ناکامی' ذلت وخواری' محکومی و عاجزی' افلاس' غربت' ان تمام صفات کو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر عذاب سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم ہے۔ اس لئے یہ تمام صفات منطقی طور پر فرقہ بندی کے نتیجہ میں حاصل ہونا لازمی ہیں اور قرآن کریم کی تنزیر کی صداقت ہم سب کے سامنے ہے کہ ہم میں فرقہ بندی اور تفرقہ اندازی کی وجہ سے وہ سارے مصائب و اسقام موجود ہیں جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کے نتیجہ میں لفظ عذاب کے ضمن میں شمار کرائے ہیں۔

قرآن کریم نے اسلام کو ملتہ ابراہیم کہا ہے (2/135) یعنی وہ طریقہ جسے وحی خداوندی کی رو سے حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا تھا۔ دوسری جگہ فرمایا:

مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا (22/78)-

تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو' اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے' نزول قرآن سے پہلے بھی اور قرآن میں بھی۔

اس سے عیاں ہوتا ہے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کی ملت ہیں۔ انہوں نے ہی ہمارا نام ''مسلم'' رکھا ہے جو ان کے وقت سے لے کر آج تک ہمارا نام ہے' اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے نام سے موسوم کرنا اور کسی تشخص سے خود کو معروف کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ یہ تاکید بھی فرمائی کہ:

فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ (2/132)-

تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔

انسان کی آخری حالت موت کی ہی ہوتی ہے جس میں ہر انسان چاہتا ہے کہ ایسی حالت میں فوت ہو کہ اس کا پروردگار اس سے راضی ہو اس آخری حالت کے لئے بھی یہ تاکید ہے کہ اس وقت بھی سوائے مسلمان ہونے کے اور کوئی حالت نہ ہونی چاہئے۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کی اس قدر مذمت و تنقیص کی کہ اسے شرک ٹھہرایا اور قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ اللہ تعالیٰ سے ہے' نہ رسول اللہ سے' اور نہ ہی قرآن کریم سے باقی رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی خجالت' لیکن حیرت کی

بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں یہ فرقہ بندی ایک ہزار سال سے چلی آ رہی ہے اور مسلمان اس کو تسلیم (Recognise) کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر حیرت و استعجاب اس بات پر ہے کہ ہماری پیشوائیت بھی اس کو تسلیم کرتی ہے اور کبھی اس کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتی بلکہ خود اپنے کو کسی نہ کسی فرقہ سے متعلق قرار دیتی ہے۔ وہ صرف اس بات کے خلاف ہے کہ آپس میں تصادم و تزاحم نہ ہو اور ملک میں اس کی وجہ سے فساد برپا نہ ہو اگر مختلف فرقے آپس میں رواداری' محبت و تعاون سے زندگی بسر کرلیں تو ہماری پیشوائیت کو فرقہ بندی سے قطعاً کوئی تعرض نہیں ہے۔ اتحاد بین المسلمین کے معنی ہی یہی ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد رکھیں اور باہمی تزاحم و تصادم سے اجتناب کریں لیکن اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی منع ہے اور شرک ہے۔ خواہ وہ آپس میں محبت و مودت ہی سے کیوں نہ رہیں۔ فرقہ بندی چونکہ ہم نے قبول کی ہوئی ہے اس لئے اس کے اثرات' عقائد کے علاوہ تفسیر' حدیث' تاریخ سب میں ہی سرایت کئے ہوئے ہیں اور ہر فرقے نے عقائد کے اختلاف کے علاوہ تفسیر' حدیث' تاریخ کو بھی متاثر کیا جس کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

قرآن کریم نے قرآن فہمی کے اصول و ضوابط خود متعین فرمائے ہیں جن کے مطابق اگر قرآن کریم کو سمجھا جائے تو دو اور دو چار کی طرح قرآن کریم خود سمجھ میں آتا چلا جاتا ہے۔ منجملہ دیگر اصولوں کے قرآن فہمی کا پہلا اصول جو خود قرآن نے وضاحت سے بیان فرمایا ہے تصریف آیات ہے۔

انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (6/65)-

دیکھئے تو سہی ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ لوگ ان کو سمجھ جائیں۔

حضورﷺ کے متعلق بھی بیان فرمایا کہ حضورﷺ کا طریقہ بھی قرآن فہمی کا تصریف آیات ہی تھا۔

وَكَذَلِكَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (6/105)-

اور اے رسول ہم اسی طرح آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا (اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیتوں کو خود تبین کر دیں۔

فلہٰذا ثابت ہوا کہ رسول اکرم اس قرآنی حکم کے مطابق تصریف آیات ہی کے ذریعے درس قرآن دیا کرتے تھے یعنی آپ کا طریقہ تفقہ بھی تصریف آیات ہی تھا لیکن ہمارے ہاں تفاسیر میں اس قدر اہم طریقہ جو خود حضورﷺ کی سنت بھی ہے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ کسی معروف تفسیر کو اٹھا کر دیکھ لیں' اس اصول کو کسی مفسر نے بھی پیش نگاہ نہیں رکھا بلکہ اسکے بجائے شان نزول کو قرآن فہمی کا اہم اصول شمار کیا گیا ہے' جو ہر مفسر نے اپنے پیش نگاہ رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تصریف آیات سے کسی

فرقہ کی تائید مشکل تھی۔ شان نزول کی وجہ سے مختلف فرقوں کی تائید آسانی سے مہیا ہو جاتی ہے۔ شان نزول مختلف ہونے سے آیت کا مفہوم ہی بالکل مختلف ہو جاتا ہے مثلاً جو آیات مجموعی طور پر صحابہ کی تعریف و توصیف میں وارد ہوئیں اور جن کا تعلق کسی بھی خاص شخصیت سے نہیں تھا شان نزول نے ان آیات کو مختلف حضرات کے متعلق قرار دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ نے ان سے کسی کی تعریف مقصود لی اور دوسرے فرقے نے کسی دوسرے صاحب کی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ہی آیت کے دو دو تین تین شان نزول بیان کر دیئے گئے۔ قرآن کریم عالمگیر ضابطہ حیات ہے (28/1) اس کے احکام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہیں لیکن شان نزول کی وجہ سے قرآنی احکام کی عمومیت کو، جو قیامت تک کے لئے پوری نوع انسانی کے لئے تھی صرف چند افراد تک محدود کر دیا گیا ہے۔ آپ سارا قرآن کریم پڑھ جائیں، ہر ایک آیت کسی نہ کسی شخصیت یا کسی نہ کسی واقعہ سے متعلق کر دی گئی ہوگی (مثالیں آگے آتی ہیں) اور اس کی عمومیت ختم کر دی جاتی ہے۔ اس طرح شان نزول کا عقیدہ نہ صرف قرآن کریم کے سمجھنے میں ایک رکاوٹ ہے بلکہ اس سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے، اور صرف فرقہ بندی کی تقویت کے لئے ہی اس کو ایجاد کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں حضورﷺ کو کفار کے لئے طلب مغفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ فرمایا:

اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (9/80)-

اے رسول ان منافقین کے لئے آپ مغفرت طلب کریں یا نہ کریں، ہمارے لئے برابر ہے۔ اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔

آیت کریمہ اتنی صاف اور واضح ہے کہ ہر شخص اس کا مفہوم با آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس میں حضورﷺ کو منافقین کے لئے مغفرت طلب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ حضورﷺ اگر ان کے لئے طلب مغفرت کر بھی لیں تو وہ بے سود ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔ اس وضاحت کے بعد اب آپ ایک اور آیت کا شان نزول ملاحظہ فرمائیں۔

عبداللہ نافع بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی (منافق) جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا، حضورﷺ کے پاس آیا، اور عرض کیا یا رسول اللہ، ہمیں اپنا کرتہ عنایت فرما دیں کہ ہم میں سے اس کا کفن بنائیں اور آپ اس پر (جنازے کی) نماز پڑھائیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ نبی صلعم نے اس کو اپنا کرتہ عنایت کیا اور فرمایا کہ مجھے خبر دینا تو میں نماز پڑھا دوں گا۔ جب آپ نے اس پر نماز پڑھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپﷺ کو کھینچا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین پر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ (9/80) آپﷺ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ) تم ان کے لئے دعا مغفرت کرو یا نہ کرو۔ اگر تم ان

کے لئے ستر بار بھی دعائے مغفرت کرو گے تو بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشے گا۔ چنانچہ آپ نے اس پر نماز پڑھی تو یہ آیت اتری: وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَداً (9/84) اوران میں سے کسی پر کبھی نماز نہ پڑھنا جب وہ مر جائیں۔ (بخاری شریف' قرآن محل کراچی' جلداول' صفحہ 485)۔ یہ ہے وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَداً کا شان نزول کہ آیت کریمہ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کے انداز بلاغت سے حضرت عمرؓ تو یہ بات سمجھ گئے کہ حضورﷺ کو منافقین کے لئے دعائے مغفرت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن خود حضورﷺ نے قرآنی انداز فصاحت و بلاغت سے الٹا مفہوم اخذ فرمایا کہ: ''اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کے الفاظ میں آپ کو منافقوں کے لئے طلب مغفرت کرنے یا نہ کرنے کے دونوں اختیار عطا فرمائے گئے ہیں اور اس غلط اخذ شدہ مفہوم کی بنا پر (روایات کی رو سے) حضرت عمرؓ کے منع کرنے بلکہ مصلے پر سے کھینچنے کے باوجود آیت نمبر (9/80) کی مخالفت کا ارتکاب کر جائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کے فہم کی تصدیق اور حضورﷺ کے فہم کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کے لئے کہ آپ نے (9/80) کا مفہوم درست نہیں سمجھا' یہ آیت کریمہ وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُم نازل فرمائی۔

ایک اور آیت کریمہ مع ترجمہ کے ملاحظہ فرمائیں:

وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاء أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاء فَلَمْ تَجِدُواْ مَاء فَتَيَمَّمُواْ صَعِيداً طَيِّباً فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ مَا يُرِيدُ اللّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ (5/6)-

اگر تم بیمار ہو یا تم سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے یا بیوی سے لمس کرے اور پانی نہ پائے تو آلائش کو پاکیزہ مٹی کے ساتھ صاف کر لیا کرو اور منہ اور ہاتھوں سے گرد و غبار پونچھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتا۔

آیت کریمہ بالکل صاف ہے۔ قرآن کریم ہر مسئلے کی ضروری شقیں ساتھ ساتھ بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔ کسی قسم کا کوئی ابہام و اشکال نہیں ہے۔ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی اس آیت کو بخوبی سمجھ کے اس پر عمل کر سکتا ہے لیکن اب اس کا شان نزول ملاحظہ فرمائیں۔

حضور اکرمﷺ صحابہ کرامؓ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔ قافلہ ایسے مقام پر تھا جہاں پانی موجود نہیں تھا۔ قافلے کو روانگی کا حکم ہوا چنانچہ کوچ ہونے والا تھا کہ حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا۔ ہار کی تلاش میں نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔ صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو طعنے دینے شروع کر دیئے کہ دیکھیں آپ کی بیٹی نے کیا کیا۔ نماز کا وقت جا رہا ہے' پانی یہاں ہے نہیں اور اس نے قافلہ کو روک دیا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے انہیں بہت سخت و سست کہا لیکن انہوں نے اس لئے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ

حضورﷺ ان کے زانو پر سر رکھ کر سوئے ہوئے تھے۔ حضرت عائشہؓ صحابہ رسول اور اپنے والد بزرگوار کے طعنوں کو سہہ گئیں تو اس وقت تیمّم کا حکم نازل ہوا کہ پانی نہ ہو تو تیمّم کر لیا کرو۔ (ملخص بخاری شریف' قرآن محل' صفحہ 770)۔

آیت بالکل واضح ہے۔ کسی تفسیر یا شانِ نزول کی ضرورت نہیں۔ لیکن شان نزول نے ناموس رسالت وعزت صحابہؓ کو مجروح کیا۔ قافلہ میں سب صحابہؓ نماز کے لئے تیار ہیں اور وقت کی قلت کی وجہ سے پریشان ہیں مگر حضورﷺ سفر کے دوران بھی بالکل بےفکری کے عالم میں اپنی زوجہ محترمہ کے زانو پر سر رکھے آرام فرما رہے ہیں اور نماز کا کوئی خیال تک نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہارگم ہو جانا اس قدر بڑا جرم نہیں کہ سب صحابہؓ اور حضرت ابوبکرؓ اس پر اس قدر برہم ہوں اور حضرت عائشہؓ کا کوئی پاس کسی کو نہیں تیسری بات یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ کو اس کا علم نہیں تھا کہ ہم مسلمانوں پر ایسے وقت بھی آئیں گے جہاں وضو کے لئے پانی دستیاب نہیں ہوگا۔ تیمّم کا حکم ساتھ ہی کیوں نہ نازل فرما دیا کہ جہاں پانی نہ ہو وہاں تیمّم کر لیا کرو۔ اصل بات یہی ہے کہ یہ حکم وضو کے حکم کے ساتھ ہی نازل ہوا ہے کیونکہ یہ آیت وضو کی آیت کے بالکل متصل وملحق ہے۔

عقلی اعتبار سے بھی شان نزول کا تصور درست معلوم نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی منشا وتدبیر کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اگر بالفرض وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی یا اگر واقعات زیادہ پیش آ جاتے یا ان سے مختلف نوعیت کے پیش آتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ممکن تھا یہ نظریہ عقل کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔ قرآن کریم کے نجماً نجماً نازل ہونے پر کفار اعتراض کرتے تھے کہ قرآن یکمشت کیوں نہیں نازل ہو گیا۔ سورہ فرقان میں ان کا اعتراض اور ان کے اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جبکہ فرمایا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا o (25/32)-

اور جو لوگ اس ضابطہ حیات سے انکار کرتے ہیں ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ قرآن کریم پورے کا پورا بیک وقت کیوں نہ نازل کر دیا گیا (تاکہ اس کی مجموعی تعلیم شروع میں ہی معلوم ہو جاتی) اے رسول اس قرآن کو اس لئے بتدریج نازل کیا کہ اس کے وقتاً فوقتاً نازل ہونے سے آپ کے دل کو تقویت رہے اور ہم نے اس کی بہترین ترتیب دی ہے۔

اس آیت مبارکہ سے بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ قرآن کریم ایک خاص پروگرام اور ترتیب کے مطابق نازل ہوا ہے۔ یہ Hap hazardly نازل نہیں ہوا اور اس کے نزول سے کسی بھی واقعہ یا شخصیت کا کوئی تعلق نہیں تھا اور قرآن فہمی کے لئے شان نزول معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تفسیر کے بعد اسی طرح روایات' جن کو احادیث رسول کہا جاتا ہے فرقہ بندی کی زد میں آئیں۔ مختلف فرقوں نے

اپنے اپنے ذخیرے جمع کئے۔ان حضرات نے لاکھوں حدیثوں میں سے جن احادیث کا انتخاب کیا' وہ انتخاب ان کی ذاتی بصیرت اور فیصلے کا نتیجہ تھا۔ان روایات کے صحیح ہونے کے متعلق نہ تو ان کے پاس خدا کی سند تھی اور نہ ہی اس کی سند حضورﷺ نے عنایت فرمائی تھی۔ نہ ہی ان کے پاس پہلے کا کوئی تحریری ریکارڈ (Written Material) تھا جس سے انہوں نے ان روایات کا انتخاب کرلیا ہو۔لوگوں کی زبانی باتیں تھیں جنہیں انہوں نے اپنے عقائد ومیلانات وترجیحات کے مطابق چھان پھٹک کر کے اپنے مجامیع میں شامل کیا۔ان میں سے بیشتر وہ تھیں جوان کے عقائد کوتقویت دیتی تھیں۔اسی وجہ سے مختلف فرقوں کی مختلف کتب احادیث مرتب ہوئیں۔صحاح ستہ اور کتب اربعہ کی احادیث کا آپ ایک نظر مطالعہ فرمائیں۔مشکل سے کوئی قدر مشترک ملے گی۔قرآن کریم سے تو فرقہ بندی کوکوئی تقویت نہیں ملتی البتہ احادیث کے مجموعے اپنے اپنے فرقوں کو نہ صرف تقویت دیتے ہیں بلکہ فرقہ بندی کوبھی جائز قرار دیتے ہیں جو قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور تصریف آیات کے بجائے احادیث کے ذریعے جب آیات کی تفسیر کی جاتی ہے تو اور بھی فرقہ پرستی میں اضافہ ہوتا ہے۔

شان نزول اور احادیث سے اگرچہ فرقہ بندی کو خوب خوب فروغ حاصل ہوا اور اب بھی انہیں کے سہارے فرقہ بندی قائم ہے لیکن جس چیز نے اس سے بھی زیادہ فرقہ بندی کو مضبوط کیا وہ یہ نظریہ تھا کہ حضورﷺ کوقرآن کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اور وحی ہوتی تھی اور وہ وحی' وحی خفی تھی اور موجودہ احادیث کے ذخیرے بھی وحی خفی ہی ہیں۔وحی جلی کو وحی متلوء اور وحی خفی کووحی غیر متلوء کہتے ہیں حالانکہ وحی الٰہی صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے۔خارج از قرآن وحی کا تصور بالکل باطل ہے۔مسلمانوں کے زوال کا وہ پہلا دن تھا جس دن یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ کچھ وحی تو قرآن کے اندر ہے اور کچھ وحی قرآن کے باہر۔احادیث میں ہے یہ عقیدہ اپنے اپنے نظریات کو جائز قرار دینے اور انہیں Justify کرنے کے لئے قائم کیا گیا اور اس نے مسلمانوں میں ایک مستقل عقیدہ کی شکل اختیار کر لی اور ان کے زوال وادبار کا باعث بنا۔اس سے ایک ایسا دروازہ کھل گیا کہ ہر عقیدہ کو وحی الٰہی قرار دے کر حضورﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا لیکن قرآن حکیم سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔قرآن کریم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وحی الٰہی صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے چنانچہ ارشاد گرامی قدر ہے:

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنبَغِي لَهُ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُّبِينٌ o (36/69)-

اور ہم نے آپ کو شاعری کا علم نہیں دیا اور وہ آپ کے شایان شان بھی نہیں۔وہ تو محض ایک نصیحت اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے۔ (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)۔

اس آیت کریمہ میں نفی واثبات کے ساتھ نہایت

واضح طور پر کہا گیا ہے کہ حضورﷺ کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن ہے اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کے متعلق نفی کی گئی ہے کیونکہ یہاں ھو ضمیر کا مرجع تعلیم ہے اور جو کچھ بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف ذکر یعنی قرآن ہے۔ ذکر کی وضاحت خود قرآن کریم نے سورہ حم سجدہ میں یوں فرمائی کہ:

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ o لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍo (41/41-42)-

جو لوگ اس قرآن کو جب کہ وہ انکے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں اور یہ قرآن باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے۔ یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ (مولانا اشرف علی)۔

اس آیت شریفہ نے ذکر کی خود وضاحت کر دی کہ ذکر قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے البتہ ایک اشکال بیان ذکر اور قرآن کے درمیان والی واؤ کا بھی عمداً پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ واؤ' واؤ عاطفہ ہے اور چونکہ معطف اور معطوف علیھم میں مغائرت ہوتی ہے اس لئے قرآن اور ذکر دو مختلف چیزیں ہیں لیکن درست بات یہ ہے کہ یہ واؤ' واؤ عاطفہ نہیں ہے' بلکہ یہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے چنانچہ ارشاد عالی ہے:

هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ (9/33)-

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی سچا دین دے کر بھیجا ہے۔

اگر اس آیت میں واؤ کو واؤ عاطفہ شمار کیا جائے جو مغائرت کی متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور شے ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے۔ جو باالبداہت غلط ہے لہٰذا یہاں واؤ' واؤ بیانیہ ہی لی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ بیانیہ تفسیر یہ ہے جس کے معنی ہیں کہ حضورﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن تعلیم کیا گیا ہے اور حضورﷺ کو اس کے علاوہ کوئی علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل نہیں ہوا۔ غیب کا علم بھی حضورﷺ کو جو کچھ دیا گیا وہ وحی کے ذریعے قرآن میں ہی دیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت بھی قرآن نے کر دی۔ چنانچہ سورہ یوسف' سورہ ہود اور سورہ آل عمران تینوں مقامات پر تقریباً ایک سے ہی الفاظ میں یہ بات واضح کی ہے کہ:

ذَلِكَ مِنْ أَنبَاء الْغَيْبِ نُوحِيْهِ إِلَيْكَ (3/44)

یہ غیب کی خبریں ہیں ہم ان کی وحی بھیجتے ہیں۔

اس کے علاوہ کوئی ذریعہ حضورﷺ کو آئندہ یا گزشتہ معلومات حاصل کرنے کا نہیں تھا۔ اس لئے آئندہ کے بہت سے واقعات

کے بارے میں وہ تمام روایات بے بنیاد ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے اوران سے صرف فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے اور فرقہ بندی کو تقویت دینے کے سلسلہ میں ہی یہ روایات بیان کی گئی ہیں۔

فرقہ بندی جہاں اور علوم میں سرایت کر گئی ہے' اسی سلسلہ میں ہماری تاریخ بھی آتی ہے۔قرآن کریم نے فرمایا:

وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيهَا وَغَضِبَ اللّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيماًo (4/93)-

اگر کوئی مومن کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کا ٹھکانہ ابدی جہنم ہوگا۔اس پر اللہ کا غضب وارد ہوگا۔ وہ خدا کی نگاہوں میں ملعون ہوگا۔اس کے لئے خدا نے عذابِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

قتل عمد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ملاحظہ فرمائیں اوراس کے بعد صدر اول کی مروجہ تاریخ میں ذرا اس واقعہ کے منظر کو سامنے لائیں کہ جنگ جمل اور صفین میں صحابہ کبارؓ کی نصف تعداد ایک طرف کھڑی ہے اور دوسری نصف اس کے سامنے دوسری طرف اور دونوں ایک دوسرے پر تلواروں اور نیزوں سے حملہ کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں جنگ جمل میں دس ہزار عام مومنین نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں اور دوسری جنگ جمل میں اسی طرح ستر ہزار صحابہؓ قتل کئے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ کسی خاص Issue کے سبب نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے آیات نمبر (19/96, 48/29) میں بالتصریح کہہ دیا ہے کہ صحابہ آپس میں لڑ نہیں سکتے۔ ہماری تاریخ میں کوئی بات یقینی نہیں۔عموماً واقعات مختلف فیہ ہیں' حضورﷺ کی پیدائش و وفات کی تواریخ' حضورﷺ کی اولاد' خصوصاً صاحبزادیوں کی تعداد' طے شدہ نہیں' حضورﷺ کے والدین کریمین کا ایمان مختلف فیہ ہے۔حضرت ابوطالب کے ایمان لانے یا نہ لانے کے متعلق اب تک کتب تحریر کی جاتی ہیں' مناظرے ہوتے ہیں لیکن مسئلہ وہیں کا وہیں ہے حتیٰ کہ نماز بھی جو ہمارے دین کی اہم ترین عبادت ہے اختلافات سے مستثنیٰ نہیں۔حضورﷺ نے دس سال مسلسل صحابہؓ کے مجمع میں نماز ادا کی اور دن میں پانچ مرتبہ ادا کی لیکن یہ طے نہیں ہوسکتا کہ حضورﷺ کس طرح نماز ادا کرتے تھے۔ ہاتھ باندھتے تھے یا کھولتے تھے اور اگر باندھتے تھے تو کس جگہ باندھتے تھے۔نماز کے علاوہ کسی بھی عبادت' روزہ' زکوٰۃ' خمس' جہاد' حج میں اتفاق نہیں اور آج کسی طرح معلوم نہیں ہوسکتا کہ حضورﷺ ان کی ادائیگی کس طرح فرماتے تھے۔حضورﷺ کے انتقال کے فوری بعد' خلافت کا مسئلہ پیش آیا اس کے لئے اس قدر مختلف' متضاد بیانات اور مواد کتب میں تحریر ہے کہ پڑھنے والا کسی دوٹوک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔خصوصاً سقیفہ بنی ساعدہ کے جو حالات مرقوم ہیں وہ صحابہؓ کی کوئی قابل تعریف تصویر پیش نہیں کرتے غرضیکہ تاریخ خود فرقہ بندی کی زد میں رہی اور آج کوئی صورت' کسی مسئلہ میں بھی دوٹوک فیصلہ کرنے کی نہیں ہے۔تقریباً سوا ڈیڑھ سو کتب

ہیں جو مستند خیال کی جاتی ہیں۔ جو صاحبان آج کل تاریخ اسلام میں ریسرچ کرتے ہیں وہ انہیں کتابوں میں غوطہ مارتے رہتے ہیں اور اپنے سابقہ طے شدہ عقائد کے مطابق ''لولوء لالاء'' تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ مضمون چونکہ مختصر ہے اور حوالہ جات پیش کرنے سے طوالت کا خدشہ ہے اس لئے حوالہ جات نہیں دیئے گئے' ورنہ متضاد متخالف حوالہ جات کی کوئی کمی نہیں لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ تاریخ مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اب تک اس مضمون میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو کتنی سختی اور تاکید سے منع کیا تھا لیکن اس کے باوجود ہمارا کوئی علمی اور عملی گوشہ فرقہ بندی سے محفوظ نہیں رہا۔ شروع میں یہ مندرجہ بالا سب علوم فرقہ بندی سے متاثر ہوئے اور اب یہ علوم فرقہ بندی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک Vicious Circle ہے جس کا توڑنا مشکل ہے البتہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ جب تم مشکلات میں گھر جاؤ اور کوئی راہ نکلنے کی نظر نہ آئے تو قرآن کریم سے راہنمائی حاصل کرو۔ وہی حال المشکلات اور مشکل کشا ہے۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ (40/60) اور تمہارے پروردگار نے فرمایا کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست کا جواب دوں گا۔ اللہ تعالیٰ کا جواب اس کے کلام' قرآن کریم سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔

قرآن کریم کے مطابق مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے علاوہ کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (6/57) حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ ہر شخص سے کلام نہیں کرتا اس لئے اس نے اپنے انبیاء کرامؑ کے ذریعے اپنے احکامات اپنی کتابوں میں نازل فرمائے تاکہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جا سکے۔ آخری کتاب قرآن کریم حضورﷺ کے توسط سے انسانیت کو عطا کی گئی اور چونکہ حضورﷺ نے قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم فرمائی اور حضورﷺ اس کے اولین سربراہ تھے' اس لئے حضورﷺ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار پائی۔ فرقہ بندی کے انسداد اور قرآن فہمی کے لئے یہ نکتہ بہت اہمیت کا حامل ہے اور اس کا سمجھنا از بسکہ ضروری ہے کہ قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے۔ صلوٰۃ' زکوٰۃ' حج' تقویٰ' دین' طاغوت' فی سبیل اللہ وغیرہ یہ سب عربی زبان کے الفاظ ہیں جو نزول قرآن سے پیشتر سے عربوں میں متداول تھے لیکن قرآن کریم ان کو اپنے معانی پہنا کر اپنی اصطلاحات کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح ''اللہ و رسول'' کے الفاظ قرآن کریم اپنی ایک مخصوص جامع اور اہم اصطلاح کے طور پر استعمال فرماتا ہے چونکہ اللہ و رسول کے دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس لئے ہمارے ہاں عام طور پر اس سے مراد دو الگ الگ اطاعتیں قرار دی جاتی ہیں اور اللہ کی اطاعت سے مراد قرآن کریم کی اطاعت اور رسول کی اطاعت سے احادیث کی اطاعت مراد لی جاتی ہے۔ اس طرح عملاً رسول کا ترجمہ

احادیث قرار پاتا ہے اور چونکہ احادیث مختلف فرقوں کی مختلف ہیں اس لئے اللہ ورسول کی اطاعت بھی مختلف طریقوں سے ادا کی جانے لگی اور یہیں سے فرقہ بندی کا آغاز ہوتا ہے جو آج تک قائم ہے لیکن قرآن کریم میں ذرا سا بھی غور وتفحص کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کریم نے اللہ ورسول کے الفاظ دو الگ الگ مطاعوں (جن کی اطاعت کی جائے) کے لئے استعمال نہیں کئے بلکہ اس سے مراد اسلامی حکومت کی آخری اتھارٹی ہوتی ہے۔ حضورﷺ چونکہ اسلامی حکومت کے سربراہ تھے اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکامات نافذ ہورہے تھے اس لئے ان کی اطاعت میں اللہ ورسول دونوں کی اطاعت مضمر تھی۔ قرآن کریم کے مطابق اللہ ورسول کی اطاعت سے مراد اسلامی نظام کے حاکم اعلیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور یہ ایک اطاعت ہے اور اس کے لئے قرآن کریم سے متعدد آیات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن چونکہ اس مضمون کا موضوع یہ نہیں ہے' اس لئے صرف چند آیات بطور ثبوت کے پیش کی جاتی ہیں۔

1- جنگ احد میں جب مسلمانوں کی فوج پراگندہ ہوگئی اور حضورﷺ بالکل تنہا رہ گئے تو آپﷺ نے صحابہ کرامؓ کو آواز دی جس پر وہ دوبارہ حضورﷺ کے گرداگرد پروانوں کی طرح جمع ہوگئے۔ بظاہر یہ آواز حضورﷺ کی تھی لیکن چونکہ یہ حضورﷺ کا ذاتی بلاوا نہیں تھا بلکہ آپﷺ نے بحیثیت سربراہ مملکت اسلامیہ یہ آواز دی تھی' اس لئے اس آواز کو اللہ ورسول کی آواز قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيْمٌ o (3/172)-

جن لوگوں نے زخم کھانے کے بعد خدا اور رسول کا کہنا مانا ان میں سے جن لوگوں نے نیکی اور پرہیزگاری کی ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔

2- اس نظام کے خلاف بغاوت کر کے فساد کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ اللہ ورسول کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔

إِنَّمَا جَزَاء الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْض (5/33)-

جو لوگ خدا اور اس کے رسول سے لڑتے بھڑتے اور (احکام کو نہیں مانتے) اور فساد پھیلانے کی غرض سے ملکوں ملکوں دوڑتے پھرتے ہیں ان کی سزا ایسی ہی ہے کہ یا تو مار ڈالے جائیں یا انہیں سولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں ہیر پھیر کے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں اپنے (وطن کی) سرزمین سے شہر بدر کر دیا جائے۔ (ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب)

اس آیت کریمہ میں اللہ ورسول سے مراد اسلامی نظام ہے اور اللہ ورسول سے محاربہ کا مطلب اسلامی نظام سے محاربہ کرنا ہے

ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کون لڑ سکتا ہے۔

3- إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِيْ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (33/57)-

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے۔

اس آیت مجیدہ میں اگر اللہ سے مراد ذات خداوندی اور رسول سے حضورﷺ کی ذات مراد لے لی جائے تو بات بالکل مبہم ہو جاتی ہے۔ رسول کو تو اذیت دی جا سکتی ہے کیونکہ وہ انسان تھے اور اردگرد کے لوگوں کی ان تک رسائی تھی کہ ہر طرح کی تکلیف ان کو دی جا سکتی تھی اور عملاً دی بھی گئی لیکن اللہ تعالیٰ کو تکلیف دینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ وہ انسان کی رسائی سے باہر ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف دینے سے مراد نظام خداوندی کو نقصان دینا ہے۔

ایک آیت کریمہ اس بارے میں اتنی روشن اور بین ہے کہ اس بات کے ثبوت میں صحت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَن يُهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ يَجِدْ فِيْ الأَرْضِ مُرَاغَماً كَثِيْراً وَسَعَةً وَمَن يَخْرُجْ مِن بَيْتِهِ مُهَاجِراً إِلَى اللّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللّهِ وَكَانَ اللّهُ غَفُوراً رَّحِيْماًo (4/100)-

اور جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کروں گا پھر اس کو موت آ پکڑے، تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی جگہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کئے جانے سے سوائے اسلامی حکومت (مدینہ) کی طرف ہجرت کرنے کے اور کوئی مفہوم نکل ہی نہیں سکتا اور اللہ و رسول کی اصطلاح اسلامی حکومت کے لئے استعمال ہوئی ہے۔

اللہ و رسول کے دو الفاظ ہیں لیکن چونکہ قرآن کریم نے اس کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے (بوجہ اختصار جس کی صرف چار مثالیں پیش خدمت کی جا چکی ہیں) اس لئے اس کے لئے دوسرے مقامات پر ضمیر واحد لا کر بخوبی روشن کر دیا گیا ہے کہ یہ دو اطاعتیں (قرآن و حدیث) نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ایک اطاعت ہے اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَحْلِفُونَ بِاللّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ وَاللّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُواْ مُؤْمِنِيْنَo (9/62)-

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کر لیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو اس کو راضی کر

لیں۔

یہاں اللہ و رسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ یرضوٗ میں ضمیر واحد لائی گئی ہے۔ واحد ضمیر لا کر انہیں ایک شمار کرنے سے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جملہ اللہ و رسول اصطلاح کے طور پر کسی ایک چیز کے لئے لایا گیا ہے جو صرف ایک ہے اور دو نہیں۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

أَغْنَاهُمُ اللّهُ وَرَسُولُهُ مِن فَضْلِهِ (9/74)۔

انہیں اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے غنی کر دیا۔

یعنی اس واحد مرکزی نظام نے جو حضورﷺ نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے اس نے انہیں غنی کر دیا۔ **فضلہ** میں ضمیر واحد لا کر دونوں الفاظ اللہ اور رسول کو بطور ایک اصطلاح استعمال کر کے ایک قرار دیا گیا ہے۔

جب تک یہ اطاعتیں ایک رہیں اور اسلام بطور دین کے قائم رہا اور قرآن کریم بطور ضابطہ حیات اس میں نافذ رہا اور اس دین کی اطاعت ہی اللہ اور رسول کی اطاعت شمار کی جاتی رہی' اس وقت تک مسلمانوں میں نہ کسی قسم کا تفرقہ تھا اور نہ ہی کوئی مذہبی فرقہ راہ پا سکا۔ مذہبی فرقہ بننے کا امکان ہی نہیں تھا کیونکہ اس نظام کی اطاعت سب پر لازمی تھی۔ جو اسلامی حکومت کے مرکز کی طرف سے حکم جاری ہوا' اس کا اطلاق ایک ایک شہری پر لازمی تھا اور اس کی اطاعت سب پر فرض تھی اور اس کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت تھی لیکن جب نہ صرف مسلمانوں بلکہ انسانیت کی بدقسمتی سے دین کا نظام ختم ہوا اور ان اطاعتوں سے بجائے ایک اطاعت کے دو اطاعتیں شمار کی جانے لگیں تو مسلمانوں میں فرقہ بندی کی ابتدا ہو گئی۔ فرقے مذہب میں ہوتے ہیں' دین کے نظام میں تو فرقہ بندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جس دن سے اللہ اور رسول کی اطاعت کا غلط مفہوم لینا شروع کیا وہ ہی مسلمانوں کے ادبار کا پہلا سنگ میل تھا۔ سب سے پہلے دین اور دنیا کی تفریق پیدا ہوئی اور مختلف حضرات اور مختلف گروہوں کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت کا مفہوم مختلف ہو گیا اور اسی اختلاف کی وجہ سے فرقے بن گئے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں مزید استحکام پیدا ہوتا چلا گیا چونکہ حکومت کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت نہیں رہی اور اللہ و رسول کی اطاعت انفرادی قرار دی جانے لگی' اس لئے اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے مختلف فقہ بنے اور ہر فقہ کے متبعین دوسرے فقہ کے پیروکاروں کو گمراہ سمجھنے لگے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں میں تفریق فقہ کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ایک فقہ کے متبعین کا ایک فرقہ ہے اور دوسرے فقہ کے متبعین دوسرا فرقہ شمار ہوتے ہیں اور فقہ کے اختلاف کی وجہ سے ہی آپس میں اس قدر بغض و عناد ہے۔

عقائد کا تعلق دنیا میں عملی زندگی پر براہ راست کم پڑتا ہے جو واقعات تاریخ اسلام میں گزر چکے' ان کو نہ تو کوئی مٹا سکتا (Un-do) ہے اور نہ ہی ان کا کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ ہماری روز کی زندگی میں جس چیز کا اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے اور جس سے کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے وہ فقہ کا ہی اختلاف ہے۔ وہی

ہماری عبادات پر حاوی ہے اور اسی کی بنیاد پر عدالتوں میں فیصلے ہوتے ہیں اور انہیں کو عدالتوں میں نظائر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن ہماری فقہ جس کو ہم سب اس قدر اہمیت اور تقدس دیتے ہیں اس کی اصل صورت حال یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم کے خلاف ہے اور اس پر غور کرنے کے سلسلہ میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

اولاً جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے یہ تمام فقہ بنو عباس کے دور میں مدون ہوئے تھے اور وہ دور بادشاہت' پیشوائیت' جاگیرداری' استحصال' سرمایہ داری کا دور تھا۔ بادشاہت کی وجہ سے سخت استبداد تھی' فکر کی آزادی بالکل مسلوب تھی۔ اقلیتوں' مزدوروں' کسانوں' غریبوں' بچوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا خصوصاً عورتوں کے حقوق کا بالکل فقدان تھا۔ عورتوں کے متعلق زیادہ تر قوانین قرآن کریم کے بالکل خلاف بنائے گئے۔ وہ قرآن کریم جو انسانیت کو آزاد کرانے کے لئے آیا تھا' اسی سے برده فروشی اور غلامی کے قوانین کی سند حاصل کی گئی۔ جتنے ذرائع Exploitation of man by man کی مدد کے لئے تھے' فقہ نے ان سب کو بالکل کھول دیا' قرآن کریم جتنی Revolutionary اور Progressive کتاب ہے' اتنا ہی اس کو فقہ کے قوانین میں جکڑ کے Retro-gressive بنا دیا۔

ثانیاً قابل غور یہ بات ہے کہ وہ دور بالکل ابتدائی اور سادہ دور تھا۔ آج کل کے مشکل اور پیچیدہ مسائل اس زمانہ میں درپیش نہیں تھے۔ آج کے پیچیدہ مسائل کا دس فیصد حصہ بھی اس وقت موجود نہیں تھا' موجودہ دور کے مسائل کا اس زمانہ میں فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ثالثاً یہ امر قابل لحاظ ہے کہ انسانی عقل اور انسانی معاشرے آہستہ آہستہ ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں' آج سے ایک ہزار سال پیشتر مغربی ممالک میں بھی جو قوانین بہت سخت' خلاف عقل اور جامد تھے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے قوانین کی تشکیل میں عقل و بصیرت سے کام لیا اور آج ان کے قوانین اس ایک ہزار سال پیشتر کے قوانین سے بہت مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں آج سے ایک ہزار سال پیشتر انسانی عقل اور انسانی معاشرے اس قابل نہیں تھے کہ وہ ایسے عمدہ' قابل عمل اور بصیرت پر مبنی قوانین بنا سکیں کہ وہ آج ہمارا ساتھ دے سکیں۔ وحی الٰہی کی تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آئندہ آنے والے دور کا نہ صرف ساتھ دے سکے' بلکہ ہر دور میں راہنمائی بھی کرے اور عقل انسانی سے آگے آگے بھی رہے لیکن انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ عقل انسانی اپنے ماحول سے یقیناً متاثر ہوتی ہے اور وہ کسی حال میں بھی اپنے زمانہ سے آگے نہیں جا سکتی۔ ہمارے فقہائے عظام کے بنائے ہوئے قوانین بھی اپنے مخصوص معاشروں سے متاثر ہوئے ہیں اور وہ اپنے دور کے لئے تو خود مکتفی تھے آج کے دور کا وہ ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔

رابعاً یہ نکتہ پیش خدمت کرنا ضروری ہے کہ اسلامی

حکومت اور مسلم حکومت میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ ہر مسلم حکومت اسلامی حکومت نہیں ہوتی مثلاً ہمارے اس دور میں ترکی، مصر، مراکش، انڈونیشیا وغیرہ کی حکومتیں مسلم حکومتیں ہیں کیونکہ وہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ہے لیکن یہ حکومتیں اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح بنوعباس کے دور کی حکومت بے شک مسلم حکومت تھی کیونکہ اس کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی لیکن وہ اسلامی حکومت نہیں تھی۔ بادشاہت کا ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلامی حکومت نہیں تھی بلکہ بادشاہت پر مبنی نظام تھا وہ غیر اسلامی حکومت تھی۔ غیر اسلامی حکومت کے نافذ کردہ قوانین اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ چونکہ یہ قوانین خود غیر اسلامی حکومت کے مدون کردہ تھے، اس لئے وہ کسی طرح بھی اسلامی قوانین قرار نہیں دیئے جاسکتے لیکن ہم نے انہیں قوانین کو اسلامی ٹھہرا کر اپنی فقہ قرار دیا ہوا ہے۔ فقہ اسلامی یا شریعت اسلامی، اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین ہوتے ہیں۔ آج اگر پھر سے اسلامی نظام کسی جگہ متمکن ہو جائے تو اس حکومت کے قوانین ہی فقہ اسلامی اور اسلامی شریعت ہوں گے ہم ان سابقہ غیر اسلامی حکومتوں کے قوانین کا اتباع کرنے کے پابند نہیں ہیں۔

قرآنِ کریم کا واضح حکم ہے کہ:

اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلاَ تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء (7/3)-

جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

قرآن کریم نے ''اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ کے جملہ موجبہ سے صرف قرآن کریم کے اتباع کا حکم فرمایا اور وَلاَ تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء کے سالبہ جملہ سے قرآن کریم کے علاوہ ہر مذہب، فرقہ، فقہ، مشرب اور مسلک کے اتباع کی نفی فرما دی لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ قرآن کریم محض تبرکاً ہی رہ گیا ہے اور اتباع کے لئے مختلف فقہ اور اپنی اپنی منتخب شخصیتیں مقرر کی گئی ہیں جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے اور جس کی پیش گوئی قرآن کریم نے آیت نمبر (3/104) میں پہلے ہی کر دی ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ مسلمان صرف وحی الٰہی اور ہر اس حکومت کے جس میں بھی الٰہی قوانین جاری ہوں، کا اتباع کرنے کے مکلّف ہیں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی پابندی ان پر لازم نہیں ہے کیونکہ اسلام نام ہے اس نظام کی اطاعت کا جو قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرے اور اس راستہ کا اتباع جو قرآن میں متعین کیا گیا ہے۔

ہمارے ہاں اتباع سنت پر بہت اصرار کیا جاتا ہے اور سنت کے مفہوم میں اتنا توسع رکھا گیا ہے کہ حضورﷺ کے ذاتی تشخصی امور بھی سنت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حضورﷺ ایک خاص خطہ زمین، اور ایک دور میں تولد ہوئے، اس لئے ظاہر ہے کہ اس ملک کی معاشرت ہی اختیار فرمانی ضروری تھی۔ حضورﷺ کے وہ معمولات جو حضورﷺ کے خورونوش، نشست

و برخواست' عام روش زندگی سے متعلق تھے۔ انہیں بھی سنت کی تعریف میں شامل کر کے ان کے اتباع پر اصرار کیا جاتا ہے لیکن حیرت ہے کہ حضورﷺ کی اولین سنت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ حضورﷺ کی اولین سنت یہ ہے کہ وہ صرف قرآن کا اتباع کرتے تھے۔ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ (10/15) میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی سے جو عذاب خداوندی وارد ہوتا ہے اس سے وہ خائف رہتے تھے۔ (10/15) حضورﷺ کو اس کا حکم دیا گیا تھا۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَى إِلَيْكَ (10/109) 'اے رسول جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو۔ اسی راستہ کے اتباع کو حضورﷺ نے صراط مستقیم کا اتباع قرار دیا ہے۔ وَأَنَّ هَـٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوهُ (6/154)۔ یہ ہے وہ صراط مستقیم جس پر میں گامزن ہوں' تم سب بھی اسی کا اتباع کرو۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کا اتباع ہی اتباع سنت رسول اللہ ہے اسے اور کسی جگہ تلاش کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں اور جو حضرات اتباع سنت پر اصرار کرتے ہیں انہیں سب سے پہلے حضورﷺ کی اسی سنت کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے حضورﷺ کو اول المسلمین قرار دیا ہے حضورﷺ نے اپنے آپ کو ہمیشہ مسلم ہی کہا ہے اور اس میں تقدم زمانی کے ساتھ ساتھ تفوق کیفی بھی شامل ہے یعنی حضورﷺ نہ صرف سب سے پہلے مسلمان ہوئے بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی حضورﷺ اول المسلمین ہیں۔ ان کی مثل اور نظیر اور کوئی مسلمان نہیں۔ قرآن کریم کے واضح حکم کا اتباع کرتے ہوئے حضورﷺ نے اپنے کو ہمیشہ مسلم ہی قرار دیا' اس لئے اس سنت سے اہم اور ضروری سنت اور کون سی ہوسکتی ہے لیکن افسوس کہ جو حضرات اور تمام سنتوں جیسے مسواک کرنا' ایک خاص وضع کا لباس پہننا' بیٹھ کے پانی پینا وغیرہ جیسی سنتوں تک کی نگہداشت کرتے ہیں وہ اس سنت پر بالکل عمل نہیں کرتے۔

سابقہ صفحات میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے اور فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق اللہ' اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب سے بالکل نہیں رہتا۔ ان میں سے ہر شق کے بارے میں متعلقہ آیات ساتھ ساتھ درج کی گئی ہیں۔ مزید یہ تحریر کیا گیا ہے کہ حضورﷺ کی سنت بھی وہی ہے کہ فرقہ بندی سے مجتنب رہا جائے اور اپنے آپ کو صرف مسلمان کہا جائے لیکن حیرت کی بات ہے کہ دستور پاکستان میں ان دونوں باتوں کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے اور فرقہ واریت کو آئینی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل 227(1) میں درج ہے۔

> ''تمام موجودہ قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان احکام کے خلاف ہو۔''

اس شق کے مطابق تمام قوانین کا ماخذ صرف قرآن و سنت کو قرار دیا گیا تھا اور کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف

وضع نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے بعد صدارتی حکم نمبر 14 مجریہ 18 ستمبر 1980ء میں ان قوانین کے سلسلہ میں مزید ترمیم ان الفاظ میں کر دی گئی۔

وضاحت: جب ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں کے کسی فرقہ کے پرسنل لاء (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن وسنت سے مراد اس فرقہ کی اپنی تعبیر ہوگی''۔

دستور کی شق نمبر (1)227 کی اس ترمیم سے فرقہ بندی کو پورا پورا آئینی تحفظ مل گیا جس سے عملاً دو دشواریوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ پہلی دشواری یہ ہوگی کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے مختلف فرقوں کے لئے شخصی قوانین کی حد تک' مختلف قوانین وضع کئے جائیں گے۔ اس طرح ایک ملک میں کئی قوانین کا نفاذ ہوگا۔ دوسری بات جو قابل غور ہے۔ یہ ہے کہ اس طرح پرسنل لاء اور پبلک لاء میں قوانین تقسیم کر دیئے گئے۔ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق بالکل غیر قرآنی ہے۔ یہ تفریق غیر اسلامی حکومت میں ہوتی ہے جہاں پبلک لاء تو سیکولر ہوتے ہیں اور وہاں پرسنل لاء اسلامی جاری کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب حکومت ہی اسلامی ہو تو وہاں پرسنل اور پبلک لاء کی تفریق مناسب نہیں۔ اسلامی حکومت میں قوانین' حکومت کی طرف سے مدون اور جاری ہوتے ہیں۔ ان کا اطلاق سب مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قرآن و سنت کو مختلف فرقوں کے معیارات میں جانچنے کی پابندی کو ختم کر دیا جائے کیونکہ جب تک یہ پابندی ختم نہیں ہوگی نہ عدالت کچھ کر سکے گی اور نہ قرآن وسنت کو صحیح مقام حاصل ہوگا لہٰذا ملک میں فرقہ بندی کو مزید تقویت ملنے سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قوانین کو وضع کرنے کے لئے عدالت کو صرف قرآن وسنت تک ہی پابند کیا جائے اور اس کے علاوہ ہر اس پابندی سے آزاد کر دیا جائے جس سے قانون سازی میں مزید دشواریاں بھی پیدا ہوں اور فرقہ بندی کو بھی مزید فروغ حاصل ہونے کا خدشہ ہو۔ نیز ہر مسلمان شہری کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ قرآن کریم کی اطاعت اور حضورﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف مسلمان کہے اور اس کے علاوہ کسی اور نام سے اپنے آپ کو موسوم نہ کرے۔ اگر حکومت مناسب سمجھے اور عوام تعاون کریں تو حکومت اس کو قانون کی حیثیت سے نافذ کر دے اور اس کے عدم تعمیل کی صورت کو جرم قرار دے۔

آج مسلمان جس مجبور و مقہور حالت میں ہیں اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے فرقہ بندی کی لعنت سے جان چھڑانا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے مسلمان غالب رہنے کے لئے آیا ہے مغلوب ہونے کے لئے نہیں۔ امت مسلمہ کو حکم ہے کہ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً (16/123) تم ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر ملت ابراہیمی کا اتباع کرو۔ حضرت ابراہیمؑ کو **اماماً للناس** کہا گیا کہ وہ ساری انسانیت کے امام ہیں۔ ان کا مقام ساری انسانیت کے لئے رہبر اور قائد کا مقام ہے اور ہم مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ

وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (2/125) تم مقام ابراہیم کو اپنے لئے مصلیٰ بنالو یعنی مقام کے بالکل پیچھے پیچھے چلو چونکہ ابراہیم کا مقام نوع انسانی کی امامت تھی اس لئے تمہارا مقام بھی نوع انسانی کی امامت اور رہبری ہونا چاہئے نیز یہ کہ مسلمانوں کو عالم انسانیت کا نگران بنایا وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً (2/143) اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی قوم بنایا کہ جو عالمگیر حیثیت کی مالک ہے۔ ایسی بین الاقوامی کہ دنیا کی تمام قومیں، تم سے برابر فاصلے پر ہوں۔ تمہارے لئے عدل وانصاف کے زاویہ نگاہ سے تمام اقوام یکساں ہوں۔ تمہارا منصب یہ ہے کہ تم ان تمام اقوام کے اعمال و کردار کے نگران رہو اور خود تمہارے اعمال کا محاسبہ کرنے والا، اس نظام کی مرکزی اتھارٹی اور اسلامی حکومت کا حاکم اعلیٰ ہو یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی آنکھ، ان سب پر نگران اور ان کا مرکز رسول اور رسول کے بعد ان کے جانشین ان کے اعمال کے نگران۔ افسوس صد افسوس اور صد ہزار افسوس کا مقام ہے کہ قرآن کریم کے مطابق ملت اسلامیہ کا دنیا میں کیا مرتبہ و فریضہ تھا۔ ایک وہ قرآن کریم کی بیان کردہ ملت اسلامیہ ہے اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہونے کے مدعی ہیں کہ دوسروں کے اعمال کے نگران ہونا تو بڑی بات ہے ہم خود اقوام عالم میں سب سے زیادہ ذلیل و پست ہیں کیونکہ ہم نے آپس میں فرقہ بندی اور دشمنی اور عناد پیدا کیا ہوا ہے۔

جن قوموں کے پاس وحی الٰہی کی روشنی نہیں وہ کسی بھی قدر کے پابند نہیں۔ ان کی کوئی مستقل اقدار (Values) ہی نہیں جس قدر میں فائدہ دیکھا وہ اختیار کر لی۔ مگر ہم مسلمانوں کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ ہمارے پاس وحی ہونے کے سبب سے ہمارے پاس مستقل اقدار ہیں جن پر عمل کرنے کے ہم پابند ہیں اور وہی ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہیں ان اقدار پر عمل کرنا نہ صرف ہمارے لئے ضروری ہے بلکہ اس بات کی نگرانی کرنا بھی ہمارا فریضہ ہے کہ عالم انسانیت میں وہ اقدار (انسانی حقوق) نافذ و جاری ہوں۔ قرآن کریم نے ان مستقل اقدار کے لئے ایک جامع اصطلاح معروف و منکر کی استعمال کی ہے جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین سے لے کر قرآن کریم کی مستقل اقدار سب شامل ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی مستقل اقدار میں سے ایک قدر تکریم انسانیت ہے۔ مسلمان قوم کا فرض ہے کہ وہ ساری دنیا میں اس بات کی نگرانی کرے کہ دنیا کے گوشے گوشے میں تکریم انسانیت ہو رہی ہے یا نہیں۔ جان کی قدر و قیمت، محنت کا پورا پورا بدلہ، عفت، عصمت، زمین کا ساری انسانیت کے لئے برابر کا استحقاق، ہر شخص کو اس سے برابر کا فائدہ اٹھانے کا موقع دینا، بنیادی ضروریات کا فراہم ہونا، رزق، تعلیم، مکاں کا ہر شخص کے لئے مہیا ہونا عدل وانصاف کا آساں اور مفت حاصل ہونا۔ اس قسم کے بے شمار معروف میں جن کا نفاذ اسلامی حکومت کرتی ہے اور دیگر اقوام کی نگرانی کرتی ہے کہ ان سب میں یہ معروف

جاری ہوں۔قرآن کریم کے مطابق امت مسلمہ کا یہ مقام ہے اورعملاً جو ہماری حالت ہے اس کے لئے عالم میرس صورت بن کی مثال صادق آتی ہے۔

ہم مسلمانوں کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے وہ ہماری خود پیدا کردہ ہے اور ظاہر ہے کہ دیگر غیر مسلم اقوام ہماری اس حالت سے نہ صرف خوش ہیں بلکہ چاہتی ہیں کہ ہم مستقل اسی حالت میں اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہیں۔ہم اس بات کا اندازہ ہی نہیں کرتے کہ غیر مسلم اقوام کو ہمارے سے کتنی عداوت ہے اور کتنی دشمنی ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہے۔ان کی دشمنی کی ایک رمق جو ظاہر ہوتی ہے غیر مناسب نہیں ہوگا اگر اس کا مختصراً تذکرہ اس مضمون کے بالکل آخر میں کر دیا جائے تا کہ قارئین کرام کو اندازہ ہو کہ غیر مسلم اقوام کو کس قدر دشمنی ہم سے ہے۔

Mr. Samuel P.Huntington ہاورڈز یونیورسٹی میں معروف پروفیسر ہیں۔ان کا ایک مضمون The clash of civilizations ایک مشہور رسالہ Foreign Affairs کے 1993ء Summer کے Issue میں طبع ہوا ہے۔اس مضمون نے بہت شہرت پائی۔ایک تو صاحب مضمون معروف شخصیت ہیں دوسرے مضمون کا موضوع پرکشش ہے اور مضمون بھی علمی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ملخص اس مضمون کا یہ ہے کہ دنیا میں آئندہ جو تصادم ہو گا وہ تہاذیب کا ہو گا۔ایک طرف مسلمان اور کنفوشش کے پیروکار یعنی چینی وغیرہ ہوں گے اور دوسری طرف مغربی تہذیب ہوگی۔مضمون پرمغز ہے اور پروفیسر صاحب موصوف نے تاریخی حوالہ جات و واقعات پیش کرنے کے بعد اپنے نظریہ کو بخوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو کچھ ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا زیرنظر مضمون کو اس کی صحت وسقم سے کوئی تعلق نہیں۔اس زیرنظر مضمون کا جس بات سے تعلق ہے اور جو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ مضمون کے بالکل آخر میں انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ مغرب کو چاہئے کہ اپنی تہذیب کو ترقی دے اور خاص طور پر شمالی امریکہ' لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور جاپان اور روس سے بھی تعاون پر مبنی تعلقات کو فروغ دیں۔مختلف تجاویز کے بعد اصل بات جو انہوں نے تحریر کی ہے اور جس کے لئے اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

To exploit differences and conflicts among Confucian and Islamic States.

کنفوشش کے پیروکاروں اور اسلامی حکومتوں میں' آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے یعنی کنفوشش کے پیروکاروں میں جو اختلافات ہیں ان کو فروغ دینا چاہئے اور مسلم ممالک کے باشندوں میں بھی جو اختلافات' مناقشات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔یہ وہ تجاویز ہیں جو پروفیسر صاحب موصوف نے بین الاقوامی سطح پر پیش کی ہیں۔

مسلمانوں کی عزت و ذلت' اقبال' عروج و زوال

ان کے دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر انکا دین قائم ہے تو یقیناً مسلمانوں کو عروج حاصل ہوگا۔ اگر انہوں نے اپنے دین سے اعراض کیا' اپنے خودساختہ قوانین جاری کئے تو مسلمانوں کو کبھی عروج حاصل نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کے لئے عروج و تمکن حاصل کرنے اور فرقہ بندی کی لعنت کو دور کرنے کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان قرآن کریم کے نظام کو جاری کریں اور اسلام کو بحیثیت دین کے متمکن کریں مسلمانوں کی قائم کردہ اسلامی حکومت قرآن کریم کی روشنی میں اپنی ضروریات کے مطابق قانون وضع کرے وہی ان کی فقہ اور وہی ان کی شریعت ہوگی۔ ہر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین ہی اس دور کے لئے فقہ اور شریعت ہوتے ہیں۔ سابقہ فقہ اور شریعتوں کے بجائے' ان کا اتباع ہی ہر شہری کا فرض ہوتا ہے۔ اس طرح فرقہ بندی وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔

آخر میں تمام مسلمان بھائیوں سے نہایت دل سوزی' دردمندی سے درخواست ہے کہ خدارا اپنی حالت زار پر رحم کرو۔ اس سے زیادہ زوال و ادبار شاید ہی کسی اور قوم کے نصیب میں لکھا ہو۔ کیوں اللہ کے غضب اور عذاب کو آوازیں دے دے کر بلاتے ہو۔ اپنی عورتوں' بچوں' آل اولاد کو پیش نظر رکھو۔ ان پر رحم کھاؤ' آپس کی فرقہ بندی اور دشمنی ترک کر کے' قرآن کریم کا اتباع کر کے دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کرو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

اللہ و رسول ﷺ کی اصطلاح

قرآن کریم کی جن آیات میں اللہ و رسول ﷺ کے الفاظ یکجا آئے ہیں وہاں اس اصطلاح سے مراد ہے نظامِ خداوندی یعنی قرآنی نظام اور اس کی مرکزی اتھارٹی یا حاکمِ اعلیٰ۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم سے بہت سی آیات پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہاں سورہ الانفال کی آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اور اپنے رسول ﷺ دونوں کے لئے واحد کا صیغہ (عنہ) استعمال کر کے نظامِ اسلام یعنی اجتماعی نظامِ زندگی میں اطاعت کا حکم دیا ہے، پیشِ خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَلاَ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنتُمْ تَسْمَعُونَ(8/20)-

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو' اللہ و رسولؐ، یعنی نظامِ خداوندی (رسول ﷺ کے ہاتھوں متشکل کردہ قرآنی نظام) کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اور اس کے احکام کو سن کر کبھی گریز کی راہیں نہ نکالو۔ (یہ احکام اس نظام کی سنٹرل اتھارٹیؐ کی طرف سے ہیں 4/65)۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت، قرآن کی دفتین میں محفوظ اللہ کے عطا کردہ اجتماعی نظام (الدین) کی وساطت سے کی جاتی تھی اور وہ ایک ہی ہے، دو الگ الگ اطاعتیں نہیں۔ مذہب، جو نظام ہے ہی نہیں، میں دو الگ الگ اطاعتیں بتائی جاتی ہیں۔ یاد رکھئے! مذہب جس میں عقل کو دخل نہیں (ہماری روش) اللہ اور بندے کے درمیان انفرادی پرائیویٹ تعلق کا نام ہے۔ مسلکِ خانقاہیت، تصوف اس کی واضح دلیل ہے۔

اس سے اگلی آیات میں ہے کہ:

دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے احکام کو سن لیا ہے، لیکن درحقیقت وہ انہیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے (یعنی ان پر غور و فکر نہیں کرتے) قانونِ خداوندی کی رو سے بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

اگلی آیت سے تو روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس سے ہماری حالت عیاں ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ عَلِمَ اللّهُ فِيهِمْ خَيْراً لَّأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ

لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعرِضُونَ(8/23)-

(اس قسم کے لوگ جو عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں اس قابل ہی نہیں رہتے کہ صحیح بات قبول کرسکیں) اگر ان میں صحیح بات قبول کرنے کی صلاحیت (لیاقت) ہوتی تو اللہ (اپنے قانون کے مطابق) ایسا کردیتا کہ وہ اسے قبول کرلیں۔ لیکن اگر وہ (اسے ان سے بغیر اس صلاحیت کے' زبردستی) قبول کراتا تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے جیسا کہ اب منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

''اطاعت کسی حکمران کے احکام کی ہوتی ہے''۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ لگائیے۔ دنیا میں 57 آزاد وخود مختاران کے اپنے (مسلمانوں کے) ملک ہیں جن میں سے کسی ایک میں بھی اللہ ورسول ﷺ کی اطاعت کرنے کے لئے نظامِ خداوندی (الدین) قائم نہیں ہے۔ الدین قائم کرنا تو ایک طرف آج کا مسلمان اس کے متعلق تو بات تک سننے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن گناہ بخشوانے والی خود فریب مذہبی باتیں ہی باتیں سننے اور سنانے میں مگن ہے' اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ جس کا نتیجہ ہے ذلت ورسوائی اور تباہی وبربادی کا وہ مسلسل عذاب جس میں ہم ماخوذ چلے آرہے ہیں۔

اتفاق یا اتحاد

اتفاق کی ضد اختلاف ہے۔ اتفاق کا مطلب Unity ہے۔ اتحاد کے معنی Alliance ہیں۔ اس کے اندر اختلافات مضمر ہیں یہ اتحادی ممالک یا اتحادی پارٹیوں سے ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں اکثر اوقات عوام اتحاد کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ دانشور حضرات بھی خیر سے اتحاد ہی کی ڈگڈگی بجاتے ہیں لیکن اتفاق جس سے تمام اختلاف مٹ جائیں انہیں کرنے کی توفیق نہیں۔ رہی مذہبی پیشوائیت' ان کا دماغ تو خراب نہیں کہ اتفاق کی بات کرکے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماریں۔ اتفاق ہوگیا تو فرقے گئے۔ فرقے مٹ گئے تو دین قائم ہوجائے گا جس میں ان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ ہمارے پاس صرف اور صرف قرآن ہی قدرِ مشترک ہے۔ اس کے علاوہ سارے کا سارا مذہبی لٹریچر اختلافات کا باعث ہے۔ اسی لئے اللہ علیم وخبیر نے اختلافات سے احتیاط کی خاطر حکم دے رکھا ہے کہ:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعاً وَلَا تَفَرَّقُوا (3/103)-

یاد رکھو! مذہب کی طرح' دین نہ تو انفرادی مسلک کا نام ہے' نہ گروہ بندیوں کے طریقے کا۔ دین اجتماعی نظام ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم سب کے سب بلا استثناء اجتماعی طور پر' اللہ کی رسی' قرآن' اس میں نازل کردہ نظام کے ساتھ محکم طور پر وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو (کیونکہ فرقہ پرستی شرک ہے (30/31-32) اور پارٹی بازی خدا کا عذاب (6/65)۔

قرآن غیر متبدل آئین Constitution ہے لیکن حکمران' مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دار طبقہ کو اسے بطور آئین تسلیم کرنا

ناگوار ہے۔ دینِ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ (حقِ حکومت) صرف خدا کو حاصل ہوگا یعنی حکومت کتاب اللہ پر عمل کرانے کے لئے قائم کی جائے گی۔ اس کا مقصد نوعِ انسان کو عالمگیر برادری بنانا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ الکتاب یعنی ضابطہ خداوندی کو اپنا آئین تسلیم کیا جائے۔ اس سے اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ اتفاق ہوسکتا ہے (2/213)۔ لیکن فرقوں کی موجودگی میں ناممکن ہے۔ مختلف مذہبی فرقوں اور پارٹیوں میں اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اتحاد ہوا' متحدہ محاذ بنے لیکن ان کا مذہب جدا جدا رہا' مسجدیں الگ الگ رہیں جو فرقوں کی پہچان ہیں۔ پاکستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ اللہ نے کعبہ کو (مذہب نہیں) دینِ اسلام کا مرکز ٹھہرایا تاکہ امت میں وحدت قائم رہے۔ مذہبی پیشوائیت نے مسلمانوں کو پانچ مختلف مذاہب اور فرقوں میں تقسیم کر کے ان کے اثبات کی خاطر کعبہ کی اس مرکزی حیثیت کو نظروں سے اوجھل کرا دیا اور حالت یہ ہے کہ جشنِ نزولِ قرآن کا تہوار (عیدالفطر) جسے منانے کی اللہ نے قرآن میں تاکید کی ہے (10/57-58)' کعبہ کا نظم ونسق کرنے والے گروہ کے ساتھ مل کر ایک دن نہیں منایا جاتا۔ اس کی وجہ چاند کی پیدائش یا رویت نہیں' وہ تو اللہ کے مقرر کردہ وقت اور راستے پر پیہم' مسلسل رواں دواں رہتا ہے' وجہ مذہبی اختلاف ہے جو ان کے ساتھ عید تو ایک طرف کعبہ کے امام کے پیچھے نماز بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ مذہبی اختلاف انسان کو کہاں تک پہنچا دیتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے۔ یہودیت کی طرح' حضرت عیسیٰؑ کی طرف وحی کردہ تعلیم میں بھی سور' خنزیر حرام تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کے کچھ عرصہ بعد ان کے متبعین نے جب عیسائیت کا ''مذہب'' اختیار کر لیا تو اس وقت کے یہودیوں سے عداوت اور ضد کی وجہ سے انہوں نے سؤر کھانا شروع کر دیا۔ بعینہٖ عرب' مالکی مذہب والوں کے ہاں قرآن کی رو سے قبر پرستی شرک ہے لیکن حنفی مذہب والوں کے ہاں قبر پرستی عین اسلام۔ قرآن نے غیر اللہ کے نام منسوب کردہ اشیاء کو حرام ٹھہرایا لیکن ہمارے ہاں پیر کے نام کا بکرا' دیگ' کھیر' شرینی' شیر مادر کی طرح حلال ہے۔ یاللعجب۔ یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ قرآنی نظام' دین کے قائم (Establish) نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شگفتہ طاہر، کراچی

تفرقہ عذاب ہے یا جزاءالخیر

وہ حَرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اسلام کی دعوت کا منتہیٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی کو عالمگیر برادری بنانا چاہتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا صرف اُس صورت میں ممکن ہوتا ہے جب آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) یکساں ہو۔ دوسری جانب اِصرارُخداوندی ہے کہ ہم کسی انسان کے اختیار و ارادے کو سلب کر کے امت واحدہ نہیں بنانا چاہتے۔ انسانوں کو ایسا اپنے اختیار اور ارادے سے کرنا ہوگا (۵:۴۸)۔(۱۶:۹۳)(۴۲:۸)(۴۳:۳۳)۔

اب آیئے اُمتِ مُسلمہ کے موجودہ حالات میں وجود و جمود کی طرف جس کی آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) ایمان محکم ہے اور جو اپنی وحدت کا مرکز آج بھی کعبہ کو ہی تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وحدتِ قانون (قُرآن) اور وحدتِ مرکز (کعبہ) پر اس امت کے نظام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اختلاف اور تفرقہ سے یہ اُمت، اُمتِ مُسلمہ رہتی ہی نہیں۔ کیا ہم اس حقیقت سے چشم پوشی کر کے اپنے قانونِ وحدت (قُرآن) سے رُوگردانی نہیں کر رہے۔ یقیناً! یہ مقام غور طلب ہے، کہ جو نقشۂ اُمت آج ہم اقوامِ عالم کو پیش کر رہے ہیں، وہ سراسر خلافِ قانونِ وحدت ہے۔ لہٰذا جس طرح دیگر اقوامِ عالم، آج اُمتِ مسلمہ کو زچ کرنے کے لیے حربے استعمال کرتی ہیں وہ ہمارے لیے یقیناً باعثِ اذیت ہیں۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ وہ کس کس طرح اپنا بارِ شرمندگی امتِ مُسلمہ کی ہنسی اڑا کر اُتارتے ہیں۔

ہم اپنی بنیاد پر اس ضرب کاری کو سمجھنے کی کوشش اِس آئینے میں دیکھتے ہوئے کریں جس پر ہمارا ایمان ہے سوچئے کہ کیا یہ کوئی عذاب کی صورت تو نہیں۔

حکم خداوندی ہے (اُمت مسلمہ کے لیے):

۱۔ تم اُن لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور عذاب خداوندی کے مستحق قرار پا گئے۔ ایمان لانے کے بعد فرقہ بندی کفر ہے۔(۱۰۶۔۱۰۵:۳)۔

۲۔ جن لوگوں نے دین میں فرقے پیدا کر لیے رسول ﷺ کا اُن سے کوئی واسطہ نہیں۔(۶:۱۵۹)۔

۳۔ ایسی مسجد کی تعمیر جس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہوتا ہو کفر ہے اس میں کسی کو قدم تک رکھنے کی اجازت نہیں (۱۱۰۔۹:۱۰۸ توبہ) اور فرمایا کہ صلوٰۃ وحدت کا موجب ہونی چاہیے۔(۳۲۔۳۱:۳۰)۔

۴۔ پھر متنبہ کیا کہ دیکھنا! تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی اُن میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور پھر ہر فرقہ یہ کہنے میں مگن ہو گیا کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل ہیں۔(۲۳:۵۳)۔(۳۰:۳۱)۔

اب اگر ہم سے کوئی کہتا ہے کہ رسول ﷺ نے پیشگوئی کی تھی کہ اُمتِ مسلمہ کے بھی ۷۰ فرقے بن جائیں گے تو وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ تو بہر حال ہونا ہی تھا۔ لہٰذا پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے!

اتنے واضح قرآنی احکامات جو اپنی اٹل حقیقتوں کے ساتھ، اپنے دعوؤں میں سچ کی تابنا کی لیے ہوئے موجود ہیں اور ہم اپنے اعمال و افکار کو درست ثابت کرنے کے لیے غیر قرآنی دلائل کا سہارا لیں تو یہ خود اپنی ہنسی اُڑانے کے مترادف بات ہوگی۔

اُس کے بعد پھر اصرار یہ بھی ہو کہ قرآن میں جو لکھا ہے وہ سمجھنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ کہاں چھوٹی سی عقل میں اتنی بڑی بات سما سکتی ہے لہٰذا جو تمہیں واعظ یا حضرت مفتی صاحب بتا دیں وہ کافی ہے جنت حاصل کرنے کے لئے! دنیا کے حالات تو ایسے ہی رہیں گے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کیا مشکل بات تھی، ساری انسانیت راہِ راست پر آ جاتی۔ قرآن پڑھو، ذکرِ الٰہی کرو، ثواب کماؤ اور اپنی قبر کی فکر کرو! سوچئے نزولِ قرآن کی غرض و غایت اس قسم کی تبلیغ سے کس طرح بدل چکی ہے۔ آج اُمتِ مسلمہ جس دلدل میں دھنسی جا رہی ہے یہ مقامِ عبرت ہے۔ کیا ہم نے قرآن کی تعلیمات چھوڑ کر اسلاف پرستی کا راستہ نہیں اپنا لیا؟ اُس کے بعد جب یہ بھی کہا جائے کہ معاذ اللہ! قرآن میں احکامات ہی بغیر ربط کے ہیں، بہر حال ہم تو صاف انحراف اسی کو کہیں گے۔

کہا جاتا ہے اللہ نے قرآن کو یاد کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے جبکہ قرآن تو صرف کتابِ عمل ہے کہیں یاد کرنے پر زور نہیں دیا گیا قرآن کو سمجھ کر عمل کرنے کی ضرورت اب یاد کر لینے سے پوری کی جاتی ہے تو اعمال کا حال یہی ہوگا۔

قارئین کرام قرآن کی آیات ایک عام انسان کے لیے اُتاری گئی ہیں لہٰذا وہ کسی بھی مکتبہ فکر اور سوچ کے حامل انسان کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔

قرآن کا مخاطب خود حضرتِ انسان ہے جو اپنے عقل کُل ہونے کے دعوے پر اکثر نازاں رہتا ہے، قرآن اُسی عقلِ بیباک کی رہنمائی کرنے کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگر اسے یہ نعمت حاصل ہو جائے تو وہ عقل نوعِ انسانی کے لیے باعث منفعت بن جاتی ہے فرمایا گیا کہ

۱۔ جو اپنے فہم و بصیرت سے کام نہ لے، اُسے رسول ﷺ کی تبلیغ بھی فائدہ نہیں دے سکتی۔ (القرآن۔۴۳۔۴۲:۱۰)۔

(۸۱:۸۰-۲۷)۔(۵۳:۵۲-۳۰)(۲۲:۳۵)۔(۴۰:۴۳)۔ عقل والے وہ ہیں جو قرآن کو بغور سنتے ہیں اور پھر بطریقِ احسن اُس پر عمل کرتے ہیں۔ (۱۸:۳۹) مومن خدا کی آیات کے سامنے بھی اندھے، بہرے بن کر نہیں جھک جاتے۔ (۷۳:۱۲۵) قرآن کا اتباع کرنے والے ہی اہلِ حق ہیں۔ (۱۸:۳۹) ان احکامات سے ایک عام فہم وشعور رکھنے والا انسان بھی اپنے لیے لائحہ عمل تیار کرسکتا ہے، کسی مفکر کے لیے تو اس میں بیش قیمت خزانے ہیں۔ جن کو سمجھنے کے لیے صرف ذہنی بالیدگی اور پختگی کی ضرورت ہوتی ہے اُس کے لیے کسی خاص ٹریننگ کی یا دارالعلوم سے ڈگری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

اب دیکھئے نظریہ قرآن کے تحت حیوان اور انسان میں امتیاز کس شئے سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقل ہے اب جس نظریہ زندگی میں عقل کو سَلب کر دیا جائے اور دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کو Discourage کیا جائے تو قرآن کی رُو سے انسان، حیوان سے بھی بدتر ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عقل ودانش سے کام نہ لینے والوں کو شَرَّ الدَّوَآبِّ (۲۲:۸) (بدترین خلائق) سے اور حیوانات سے بھی گئے گزرے قرار دیا ہے۔

اب اس حقیقتِ کُبریٰ پر غور کریں کہ قرآن نے اسلاف کی اندھادھند تقلید اور اپنی عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کا مقام جہنم بتایا ہے۔ (۳۷:۶۹-۷۰)۔

ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر سوچئے! کیا ہمیں اپنے ہدایت نامہ کی طرف، صرف رہنمائی حاصل کرنے کے لیے رجوع کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب خود آپ کے اختیار وارادہ پر ہے۔ کوئی انسان کیا جرأت کرے گا کہ کسی کو اپنی بات منوائے، اس کا اعادہ تو خود رب کائنات نے انسان کے اپنے ارادے و اختیار پر موقوف کر دیا ہے۔ انسان اگر چاہے تو قوانین خداوندی کی اتباع کر کے اپنی زندگی جنت نظیر بنا لے اور چاہے تو جہنم کدہ۔ اُخروی زندگی تو اسی زندگی کا ماحصل ہے اس سے الگ تو بالکل نہیں ہے۔

قرآن کی رہنمائی تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ چاہے وہ کسی رنگ، نسل، زبان، علاقے یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں سب کے لئے یکساں مُفید ہوسکتی ہے۔ زندگی کے جن اصولوں کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہے وہ بے حد وُسعت لیے ہوئے ہیں اور ہر دور میں قابلِ عمل ہیں۔ اگر انسان چاہے تو ان آیات کی تشریح اپنی بھلائی کو سامنے رکھتے ہوئے کرتا رہے اگر وہ تشریحات، انسانی مفادات ومنفعت کے لحاظ سے موجبِ زندگی ہونگے تو اُن کو تقویت ملتی رہے گی۔ اُن سے زندگی نشوونما پاتی رہے گی۔

اگر وہ ان سے ہلاکتِ انسانی کے اصول مرتب کرے گا تو اس کا نتیجہ یقیناً تباہی ہوگا جو کہ آج مسلمانوں کی حالتِ زار سے صاف ظاہر ہے۔ اب ذرا اقوامِ غیر پر طائرانہ نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے مستقل اقدار کے قوانین کو اخذ کر کے اپنے یہاں وضع کر دیا تو اُن کی حالت بہتر ہوگئی، وہ خزائن

ارض وسماء سے مستفید ہونے لگے۔ انہیں قرآن کے الفاظ و معنیٰ سے کوئی عقیدت نہیں ہے وہ تو صرف یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کائنات کے خالق نے اپنی آسمانی کتاب میں جن رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے اُن سے فائدہ کیسے اُٹھانا چاہیے۔

اُن کے برعکس ہم جو عقیدت مندی کا تاج سروں پر سجائے ہر آن **آمَنّا صدَّ قنا** کہہ کر خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ انہی احکامات میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ اپنی اصلاح کرنے کی بجائے قوانین الٰہی کو اپنی مرضی و مسلک کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔

یوں ہم اس بھاری ذمے داری کو جو ایک مسلمان ہونے کی بناء ہم پر عائد ہوتی ہے، ہم بَری ذِمہ ہو جاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے ہمارے مسلک میں یہ اس طرح نہیں کہا۔ لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مان سکتے اور دوسری جانب عبادات کو خشوع و خضوع کے ساتھ منعقد کر دینے سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ حق ادا ہو گیا۔

دوسری جانب اصرارِ ربِ کائنات ہے کہ دین میں مکمل داخل ہو جاؤ۔ بتائیے کیا ہم اپنے دین کے ساتھ خود مذاق نہیں کرتے؟ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر آتا ہے کہ:

۱۔ تمام انبیاء کرام امتِ واحدہ کے افراد تھے۔ اُن کی وجہ جامعیت خدا کی محکومیت تھی، لیکن لوگوں نے باہمی اختلاف پیدا کر لیے (۲۱:۹۲۔۹۳)۔ (۴۲:۱۳۔۱۴)۔

۲۔ یہودیوں کی حالت یہ تھی کہ بظاہر وہ ایک قوم نظر آتے تھے لیکن اُن کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ اس لیے اُن پر عذاب طاری ہو گیا اور وہ تباہ ہو گئے (۵۹:۱۳۔۱۴)۔

۳۔ قوموں میں عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ پارٹیوں میں بٹ جائیں گے اور پھر یہ پارٹیاں ایک دوسرے سے الجھتی رہیں (۶:۶۵)۔

۴۔ بنی اسرائیل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے یہ خدا کا عذاب تھا (۷:۱۶۷)۔

۵۔ قومِ سبا کو ریزہ ریزہ کر کے پراگندہ کر دیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا پھر اُن کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں (۳۴:۱۹)۔

۶۔ فرعون کا جرم عظیم یہ تھا کہ وہ قوم میں تفرقہ ڈال کر انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔

ابتداً خطا انسان خود کرتا ہے اور پھر وہ اپنے اعمال کا انجام خدا کے بنائے ہوئے نظام کے تحت قانون مکافاتِ عمل کے عین مطابق حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ خدا کسی شخص یا قوم پر عذاب مسلط نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم یا شخص خود اپنے لیے تباہی و بربادی کا راستہ نہ ڈھونڈ لے اور پھر خود اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں جا گرے۔

قرآن کریم حکمت و دانائی کی مثالوں کو اکثر واقعات کے ساتھ بیان کرتا ہے تا کہ لوگ نصیحت حاصل کر سکیں۔ جیسے کہ فرمایا، جب حضرت موسیٰ علیہ سلام نے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ سے پوچھا کہ آپ نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پرستش سے کیوں نہیں روکا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں ڈرتا تھا کہ قوم میں

تفرقہ نہ پڑ جائے (۲۰:۹۴)۔ گویا تفرقہ جیسی بڑی خرابی سے بچنے کے لیئے شرک جیسی جہالت و گمراہی کو بھی وقتی طور پر برداشت کرنا پڑسکتا ہے۔ مصلحت و دانشمندی سے مسائل کو سلجھانے کا حکم رب کائنات نے دیا ہے جس پر تمام انبیاء کرام عمل کرتے چلے آئے۔ اُس کے بعد یہ ذمہ داری اُمتِ مسلمہ کے حوالے کردی گئی۔

قارئینِ کرام! پیغامِ خداوندی آج بھی اُتنا ہی واضح اور مکمل ہے۔ جو اِس دنیا کے وجود میں آنے کے بعد سے آج تک جاری وساری ہے اس دنیا کے پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک قابل عمل اور حاملِ حکمت ہے۔ اِس کتابِ محکم کے الفاظ اٹل، روشن دلیلوں کے ساتھ، کوہ ہمالیہ کی طرح مضبوط، بلند و بالا اور غیر متبدل ہیں۔ خدا کا وعدہ اپنے بندوں سے سچا ہے، وہ اپنے ارادوں میں پختہ ہے۔ لہٰذا جس کسی نے، جب بھی رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی اِس کتابِ حکمت نے اُس انسان کو صراطِ مستقیم ضرور دکھائی۔

کیا وجہ ہے، کہ آج کا مسلمان بالخصوص اور عام انسان بالعموم جس کو دعوت حق پہنچی یا نہیں پہنچی مگر اُس نے اسے قابلِ قبول نہیں سمجھا؟ وہ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ جس قرآن کی تعلیم نے نوعِ انسانی کی قسمت بدل ڈالی تھی وہ آج بھی موجود ہے لیکن ہم اب وہ انساں نہیں ہیں۔ اپنی ہی ذات کے بھنور میں غلطاں و پیچاں عمر کی گھڑیاں بِتا دیتے ہیں۔ ذرا غور کریں تو یہ مسئلہ بھی قرآنِ کریم خود بیان کرتا ہے کہ لوگ اس دعوتِ حق کو کیوں جھٹلاتے ہیں؟ اُس کو ناقابلِ عمل قرار دے کر کیوں دُور ہو جاتے ہیں۔ قرآن کی رو سے:

۱۔ تقلید اور اسلاف پرستی کی دعوت دینے والے شیطان ہیں۔ (31:21 لقمان)

(شیطان کے لفظی معنی ہیں رُکاوٹ کھڑی کرنے والا، راستہ روکنے والا۔ وہ کوئی انسان بھی ہوسکتا ہے اور کوئی نظام بھی)

۲۔ انسان کے بعض دوست شیطان ہوتے ہیں یعنی صاف کھُلی ہوئی حقیت کو سمجھنے نہیں دیتے۔ (۲۹۔۲۸، فرقان)

۳۔ مذہبی پیشوائیت لوگوں کو توہم پرستی میں رکھتی ہے تاکہ اس طرح اپنے مفاد حاصل کر سکیں یہ شیطانی روش ہے (9:34: انبیاء)۔

۴۔ اُس شخص سے زیادہ جھوٹا کون ہے۔ جو لوگوں کو بلا تحقیق گمراہ کرے بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۴۴۔النساء)۔

قرآن جو شمع ہدایت ہے وہ حکمت کی باتیں یوں ہی سمجھاتا چلا جاتا ہے۔ سوچئے اگر کوئی شخص قرآن کے متعلق، یہ نظریہ قائم کرلے کہ یہ ناقابلِ فہم وادراک کتاب ہے اور اس پر یکٹیکل، سائنسی دَور میں کس کے پاس اتنا وقت پڑا ہے کہ وہ قرآن کو سمجھنے کے لئے سارا وقت لگائے اور ہم نے کوئی مولوی بھی نہیں بننا، تو پھر اتنی محنت کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی بڑی عمر پڑی ہے اِن کاموں کے لئے پہلے وہ کریں جس کی ضرورت ہے۔

دوسری جانب عالم شوق یہ ہو کہ وہ تمام دنیاوی علوم حاصل کر لیے جائیں جن سے اُس کو فائدے حاصل ہو سکتے ہیں پھر حد و درجہ محنت کر کے اُن علوم میں ماہر بن جائے' اُن زبانوں پر جو کہ اُن علوم کو حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اُن پر بھی عبور حاصل کر لے اُس کے بعد دین کے متعلق ان نظریات کا پرچار کرے کہ مجھے تو ہدایت خدا نے دینی ہے اگر چاہے تو دے دے' نہ چاہے تو نہ دے۔ یعنی میرا ارادہ و اختیار نہیں ہے تو یہ سوچ قرآنی نظریہ کے سراسر خلاف ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو قرآن کیا ہدایت دے گا؟

قرآن کا پہلا مطالبہ ہے کہ پڑھ اپنے رَب کے نام سے جس نے قلم سے علم حاصل کرنا سکھایا۔ جس نے انسان میں یہ صلاحیت رکھی کہ وہ رازِ ارض و سما کا کھوج لگائے۔ ہمیں مسلمان سے پہلے اچھے انسان بننے کے لئے جس تربیتی پروگرام کی ضرورت ہے وہ ہمیں صرف خدائی رہنمائی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مومن کے مقام پر جانے کیلئے جن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اُن ہی دشوار راستوں کا مسافر مفکّر' دانشور' خدائی قوانین سے آگاہ سائنٹسٹ' معالج ہو سکتا ہے۔ جسکا تقاضا یہ ہو کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرآنَ۔ (کہ تم قرآن پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے)۔

قرآنی تعلیم مومنین کے لیے واضح کرتی ہے کہ وہ ایک امتِ واحدہ کے افراد ہیں لہٰذا اُن میں تفرقہ کیوں ہو (۲:۱۴۳)۔(۳:۱۱۰) مومنین سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح رہتے ہیں (۳:۱۰۳)

خدا اور رسول ﷺ (نظام خداوندی) کی اطاعت کرو باہمی تنازعات' مت پیدا کرو ورنہ تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔(۸:۴۶)

حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن کو پسِ پشت ڈال کر فرقہ بندی کر لی گئی تو پھر عوام الناس تو ان کی تقلید میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ لہٰذا یہ بحثِ لاحاصل ہے

اُمتِ مُسلمہ' اقوام عالم میں اپنی انتہائی سنہری تاریخ رقم کرنے کے بعد کیسے زوال پذیر ہوئی؟ کیا محرکات تھے؟ کیسی کیسی سازشیں کی گئیں اور کس طرح قرآن ہمارے ہاتھوں سے لے کر غلافوں اور طاقوں میں سجا دیا گیا۔ یہ تاریخ ساڑھے تیرہ سو سال پر محیط ہے۔ لیکن یہ حقیقت آج بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر' اپنے یقین محکم سے ہٹ جانے کے بعد۔ جب جہالت و گمراہی کے زہریلے ناگ ہمارے رگ و پے میں داخل ہو گئے۔ یوں رفتہ رفتہ جس اُمت کو تیار کیا گیا تھا' انسانوں کی بھلائی کے لیے اور جو نیکی کا حکم دیتی تھی اور برائی سے روکتی تھی۔ وہ بے عملی کا شکار ہو کر تقدیر کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی۔ آج وہ اپنی قسمت کا حال نجومیوں، پامسٹ ،ستاروں سے یا علم اعداد کے ذریعے معلوم کر کے صبر و شکر کی چادر اوڑھ کر غلامی اور محکومیت کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ مذہبی پیشوائیت (مُلّا' پیر' مفتی' واعظ) جس نے اِسلام اور مسلمان کا تشخص مٹا دیا ہے' جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر' دنیا میں

برتری حاصل کرنے کی غرض سے لوگوں کے جذبۂ علم وعمل کو تھپکیاں دے کر سُلا دیا ہے کہ جتنا ہم تمہیں سمجھا دیتے ہیں اسی پر اکتفا کرو، تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ سوال جواب کرنے کی اجازت نہیں ہے اس سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ جنت حاصل کرنے کے لیے جن اعمال کی ضرورت ہے ان کی لسٹ تیار ہے لے لیجئے اور دین و دنیا داری کے کام انکی روشنی میں انجام دیتے جائیے۔

آج امت مسلمہ میں تفرقہ ایک ضروری عمل ہے جس کو عین شریعت کے مطابق سمجھا جانے لگا ہے کسی بات پر اختلاف تو صحت کی نشانی ہے لہٰذا دین پر اختلاف میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس زوال شدہ امت کو، اگر کبھی اپنے اسبابِ زوال پر غور کرنے کا خیال آئے تو شاید جب تک مہلت کا وقفہ قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت گزر چکا ہو۔ لہٰذا اب بھی وقت ہے اگر ہم اللہ کی رسی (قرآنِ کریم) کو مضبوطی سے پکڑنے کی کوشش کریں اور اپنے اعمال وافکار کو ہم آہنگِ قانونِ خداوندی کر لیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری اگلی نسلیں وہ سنہری دَور نہ دیکھ سکیں۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے!
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(اقبال)

کھاتہ داران/خریدار حضرات

﴿خصوصی توجہ فرمائیں﴾

جن کھاتہ داران/خریداران نے اپنے اپنے کھاتوں سے مجلّہ طلوع اسلام جاری کروایا ہوا ہے ان سے گذارش ہے کہ وہ اپنی فہرست خریداران 15 جنوری 2009ء تک ادارہ طلوع اسلام کو بھجوادیں اور جن کو میگزین سال 2009ء کے لئے جاری رکھنا مقصود ہو یا جن کے میگزین بند کرنے ہوں، مکمل فہرست، ایڈریس، ٹیلیفون نمبر کے ساتھ بھجوادیں تا کہ بروقت عمل درآمد ہو سکے۔ شمارہ کی اشاعت میں اضافہ آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر بیرون ملک یا اندرون ملک کی بزمیں مزید تعاون کریں تو اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے اور پاکستان کے تمام تعلیمی اداروں میں میگزین بھیجنا ممکن ہو سکے گا۔ امید ہے کہ بزمیں اس مسئلہ پر تعاون کریں گی۔

کھاتہ داران جن کے ذمے طلوع اسلام کی رقم بقایا ہے ان کو ان کے کھاتوں کی تفصیل بھجوائی جارہی ہے تاہم اگر کسی وجہ سے یہ ان تک نہ بھی پہنچے تو بھی تمام کھاتہ داران سے التماس ہے کہ وہ اپنے کھاتوں میں معقول رقم جمع کرانے کا اہتمام کریں تا کہ واجب الادا رقوم کی وجہ سے ادارہ مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہو۔

جو قاری حضرات ادارہ کو رقوم بھیجتے ہیں وہ بذریعہ منی آرڈر یا بذریعہ بینک ڈرافٹ ارسال کریں۔ تا کہ بروقت رقم کھاتہ میں ٹرانسفر ہو سکے۔ اگر لاہور سے باہر کا چیک بھیجنا ہو تو 125+225 روپے مساوی 350 روپے ارسال کریں۔ باہر کا چیک اسی صورت میں جمع کرایا جائے گا اگر اس میں 125 روپے بینک چارجز اضافی شامل ہوں گے۔ بصورت دیگر چیک واپس ارسال کر دیا جائے گا۔

بینک اکاؤنٹ کے لئے ضروری وضاحت

1- بینک کا اکاؤنٹ نمبر۔ 3082-7

2- بینک کا نام۔ نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ برانچ گلبرگ، لاہور (پاکستان)۔

3- نام اکاؤنٹ۔ ادارہ طلوع اسلام

شکریہ

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام لاہور

DON'T BLAME GOD FOR OUR FAILURES

By

Ubedur Rahman Arain

Fate, destiny, luck are all intertwined words that describe an event, or a course of events, that will inevitably happen in the future, as if the course of events is predetermined. Anything that goes against our desires and expectations is attributed to bad luck, as if we had nothing to do with it.

Where is human action in all this? It is led to believe that God has pre-ordained all events till eternity and destined some to success and others to failure and how dare one question God's command? Raising your voice against injustices of others is considered as if one is challenging God's Will.

I have always considered the Holy Month of Ramadan as a month for pausing and reflection. I have been thinking about this, now, more than ever.

I wonder why would God be prejudiced against some and favor others? Are we not all His children? Hasn't He told us in the Holy Quran that there is one and only one God for all mankind? (3:2). Are there lesser Gods? How come when the heavy rains fall in Bihar, India village after village is wiped out while the same is not the fate of others in the developed countries where the flood waters have been controlled by construction of dams and levees? Katrina caused devastation just three years ago where one thousand seven hundred lives were lost and this year Gustav and Ike together could not cause even ten percent of that loss! What changed God's Will? It is just that man had learnt his lesson from the previous disaster and had prepared himself for the natural calamity by building stronger and higher levees and thus controlled the Nature, all in accordance with other laws of nature.

Same is the case of earthquakes. Countries that follow and build in compliance with the Building Codes, survive earthquakes with minimal loss of life, others have disastrous consequences. Only a few years ago, village after village of Kashmir and Northern areas of Pakistan were wiped out with deaths of over seventy five thousand people, due merely to construction of substandard houses. For similar reason, the ancient city of Bam in Iran was practically wiped out in the 2003 earthquake.

Look at the life expectancy of human being. People in the developed countries live much longer than people living in less developed countries. According to the UN projections, the average life expectancy of human beings is 67.2 years while for an average Japanese, the life expectancy is the highest at 82.6 years. In the U.K. it is 79.4 years, in U.S.A. it is 78.2 years and while in Kuwait it is 77.6

years. On the other hand people living in Indo-Pakistan sub-continent can expect to live only up to 65 years, and that is below the world average. The least being Swaziland where the life expectancy is only 39.6 years!

We have a common belief that the length of life is pre-ordained by God. The question that comes to my mind is why would God fix longer life in the developed countries and less in undeveloped countries? Mind you, this is irrespective of religion or piety of a person. Atheists and non-Muslims of the West live longer than "God fearing Muslims" of the east. For me the answer is very simple. Better health services, better diet and better overall living environment increases their average life expectancy, all in accordance with Laws of Nature that God has created for length of life. Whoever follows those laws, live longer and who does not, have a short life span. One can assume that God has indeed shortened the life of those who go against His rules for life and lengthen the lives of those who follow His rules of life.

I believe in one and only God. He is the one who is the Creator and Nourisher of all in this universe (1:1, 2:117). He has made all the Laws that have created us and the same laws are now running this universe by their measures (54:49).

Once the world came into being at the Big Bang, the process of creation started as per His Laws and that process continues to-date. The life since that time is tied in Cause and Effect. Whatever happens now is a result of some Cause. This relationship is tied by Laws of Nature that in fact are Laws of God (17:77, 33:38). While we can control our actions, we do not control the results of the actions. One can say that the result is the destiny ordained by God and we stay responsible for the cause. Thus the results alone are the destiny, and not the actions. We therefore should look for reasons for our failures within ourselves and not pass the buck. Sooner we start doing this, sooner we can find the answers and control our own destiny.

Even God clearly tells us in the Holy Quran (42:30) "All your failures are brought about by your own actions".

This discussion reminds me of subcontinent's famous poet Sir Mohammed Iqbal. In one of his poems he says, that "God only fixes destiny of inanimate objects and from human beings, He only expects obedience to His Laws". In another verse, He says, "one should develop one's personality to a level that God will have to ask man himself before fixing his fate, to tell God the destiny he wants for himself".

The success is all within our reach. All we need to do is to assume our responsibility and work at it.

==========